

سید معروف شاہ شیرازی

www.KitaboSunnat.com

اسلام

اور

جمہوریت



بجوں اور حزب نیلوں کے زیر سایہ

منشورات اسلامی پبلیکیشنز ضلع مانسہرہ



معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مَجْلِسُ التَّحْقِیْقِ الْإِسْلَامِیِّ کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

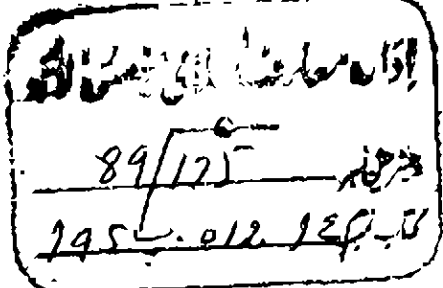
✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com



اسلام اور جمہوریت

جرنیلوں اور ججوں کے فیصلے



سید معروف شاہ شیرازی ایڈوکیٹ

www.KitaboSunnat.com

شائع کردہ ، منشورات اسلامی چٹار کوٹ ضلع مانسہرہ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

تعداد ۱۱۰۰

ملنے کا پتہ: مکتبہ تعمیر انسانیت اردو بازار، لاہور

سلسلہ نشریات ایم اے اسلام اکیڈمی

مطبوع: میٹروپولیٹن پریس

ناشر: منشورات اسلامی، چنار کوٹ ضلع مانسہرہ

قیمت ۲۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اسلام اور جمہوریت جرنیلوں اور ججوں کے زیرِ سایہ

فہرست

- پہلا باب — پاکستان کی پہلی دستوریہ اور قرارداد مقاصد
— لاہور کامار شل لاء اور مقدمات
— مولانا مودودیؒ کے خلاف مقدمہ
— مولانا عبد الستار خان نیازی کے خلاف مقدمہ
- دوسرا باب — پاکستان کی دوسری دستوریہ اور ۱۹۵۶ء کا دستور
— دو سو کیس اور ۱۹۶۲ء کا دستور
— جسٹس محمد شفیع کا فیصلہ

تیسرا باب

- ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے جانشین
- ضیاء الرحمن بنام حکومت
- عاصمہ جیلانی بنام حکومت
- ضیاء الرحمن بنام حکومت (سپریم کورٹ)

چوتھا باب

- جنرل محمد ضیاء الحق کی آمد
- نصرت بھٹو کا کیس
- فیڈرل شریعت کورٹ کا قیام -
- نظریہ ضرورت اور اسلام
- جسٹس سنزیل الرحمن کے فیصلے
- بعض حالیہ فیصلے

پانچواں باب

- اسلامی نظام حیات میں عدلیہ کے اختیارات
- مجوزہ شریعت بل (متن)
- مجوزہ شریعت بل کے بارے میں بے بنیاد خدشات

مقدمہ

پاکستان میں، بنیادی حقوق اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے معاملہ میں، عدلیہ قابل قدر مساعی انجام دیتی رہی ہے۔ ہماری عدلیہ نے بحیثیت مجموعی تشریح قانون کے معاملے میں ہمیشہ بنیادی حقوق اور قوانین کے اسلامی پہلو کو مد نظر رکھا اور عموماً بہترین فیصلے کئے۔ ان میں سے بعض فیصلے یقیناً بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں مثلاً مولانا عزیز الدین خان صاحب جماعت اسلامی پاکستان کی بحالی کے فیصلے لیکن جس طرح ہر کلیہ میں استثناء کا پہلو ہوتا ہے، اسی طرح ہمارے اس کلیے میں بھی ایک آدھ ایسا پہلو موجود ہے۔ مثلاً جسٹس منیر مرحوم کے فیصلے، جنہوں نے ہماری قومی تاریخ اور ہمارے عدالتی نظام پر ایسی شرب لگائی کہ ان فیصلوں کے بعد دو نسلیں بیت گئیں اور ملک کی کارڈی پٹری پر نہ چڑھ سکی۔

اس کے مقابلے میں ہماری انتظامیہ اور انتظامیہ کے سربراہ ان جرنیلوں نے، جنہوں نے ”آزاد و کرم“ ملک کے اقتدار پر وقتاً فوقتاً قبضہ فرمایا، ہمیشہ انصاف، بنیادی حقوق اور ملک کے اندر اسلامی قوانین کے شفاؤ کی راہ میں دانستہ و نادانستہ رکاوٹیں پیدا کیں۔ انہوں نے بنیادی حقوق معطل کئے۔ انہوں نے ہر معاملے میں عدالتوں کے دائرہ اختیار کو نہ دیا اور عدالتوں کے دائرہ اختصاص سے بیحد مداخلت کی، بلکہ انتظامیہ نے عدلیہ کے ساتھ بالکل سوتیلی ماں جیسا سلوک روارکھا۔ مثلاً آزادی کے ۲۰، ۳۰ سال گزر جانے تک بھی بعض مقامات پر عدالتوں کے لئے بلڈنگ تک نہ تھی۔ آج تک بعض مقامات ایسے ہیں، جن میں جج کے لئے رہائش کا انتظام موجود نہیں ہے۔ حالانکہ

پورے ضلع میں زیادہ سے زیادہ دو (۲) یا تین بج ہوتے ہیں۔

عدل و انصاف معاشرے کی اساسی ضروریات ہیں۔ کوئی معاشرہ جس میں عدل و انصاف نہ ہو، وہ قائم نہیں رہ سکتا، اگرچہ وہ مسلمانوں اور اہل ایمان کا معاشرہ ہو۔ اور کوئی معاشرہ جس میں عدل موجود ہو وہ ضرور قائم رہے گا، اگرچہ وہ اہل کفر کا معاشرہ ہو الملک مبقی مع الکفر ولا یتقی مع الظلم

ملک کی آزادی سے بھی پہلے، یہ مطالبہ شروع کیا گیا تھا کہ عدلیہ کو انتظامیہ سے علیحدہ کر دیا جائے، لیکن آج تک اس مطالبے کو پورا نہیں کیا گیا۔ ۱۹۷۳ء کے دستوری وعدے کے باوجود تاحال نظام عدالت کے نصف امور پر انتظامیہ کا قبضہ ہے۔ اور بے شمار ایسے قانونی دائرے قائم ہو چکے ہیں جن میں سول عدالتوں کے لئے دخل اندازی ممنوع کر دی گئی ہے۔ یوں عدلیہ کے دائرہ اختیار کو مسلسل تنگ کیا جا رہا ہے۔ اکثر اہم قوانین میں ایک دفعہ رکھ دی جاتی ہے کہ اس معاملے میں کسی سول عدالت کو اختیار سماعت حاصل نہ ہو گا۔ حالانکہ اسلامی نقطہ نظر سے کسی عدالت کے اختیار سماعت پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ اپنی اہلیت کے مطابق میں نے مختصر ایہ جائز دلیا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد گزشتہ چالیس سال کے دوران میں ہماری عدلیہ نے، بنیادی حقوق اور اسلامی نقطہ نظر سے کیا کیا اچھی مثالیں قائم کیں اور کس کس مقدمہ پر کمزوری کا شکار ہوئی ہے، اور اس معاملے میں ہمارے حکمران، خصوصاً جرنیل حکمران کیا کرتے رہے ہیں! یہ ایک مطالعہ ہے جس سے اختلاف رائے کیا جکا سکتا ہے۔ لیکن سیرے نزدیک اس کی افادیت ضرور ہے کہ ایک اتہائی اہم پہلو پر غور و فکر کا موقع پیدا ہوتا ہے۔ میرا مقصد تنقیص پر گز نہیں، بلکہ تعمیر ہے، میں نیک نیتی سے یہ بات محسوس کرتا ہوں کہ لہتی کمزوریوں سے آگاہ ہونا اور ان کے ازالے کی کوششوں میں مصروف رہنا زندگی کی ضمانت ہے۔ کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی روش ملکوں اور ملتوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ مجھے امید ہے میری اس ناچیز کاوش پر اس نقطہ نظر سے غور کیا جائے گا۔

معروف شاہ شیرازی منصور ۳۰ دسمبر ۱۹۸۷ء

پہلا باب

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

— پہلی دستوریہ

-- قرار داد مقاصد

— لاہور کامارشل لا

— مولانا مودودی کیس

— مولانا عبد الستار نیازی کیس

— مولوی تمیز الدین کیس



مولانا شبیر احمد عثمانی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

پاکستان کی پہلی دستوریہ اور قرار داد مقاصد

اگرچہ پاکستان حاصل کرنے کا مقصد واضح تھا لیکن اس سلسلے میں اختلاف کیا جاتا ہے کہ پاکستان بناتے وقت قائد اعظم محمد علی جناح کے پیش نظر کیا تھا۔ ان کے کچھ ساتھی اور پیروکار اس معاملے میں مختلف المرائے ہیں، بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ سیکولر تھے اور اس ملک کے بنانے میں ان کے پیش نظر صرف یہ مقصد تھا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کی معاشی غلامی سے آزاد کیا جائے۔ بعض دوسرے حضرات کا کہنا یہ ہے کہ وہیں ان کی تائید علامہ اقبال کے خطبہ الہ ہاؤ سے بھی ہوتی ہے اور قائد اعظم کے ان تمام اقوال، احسانات اور خطوط سے بھی جو انہوں نے مختلف اوقات میں کہے، کئے یا لکھے۔ اس رائے سے مختلف رائے صرف ایک صورت ہی میں قائم کی جاسکتی ہے کہ ان کو نعوذ باللہ ایک ذی بکار یا متافق شخص تسلیم کر لیا جائے اور یہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ان کی رفاقت اور سیکولزم دونوں کے یک وقت دعویدار ہیں، اور باقی ساری ملت پاکستان کے نزدیک تو وہ ایک اسلامی مملکت کے قیام کے خواہاں تھے۔

اس لئے کہ جب انہوں نے تقسیم ہند کا علم بلند کیا تو اس وقت اسلامیان ہند کے قائد مولانا آزاد، مولانا مہدی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ نیشنلسٹ مسلمان زعماء تھے اور مسلمانان ہند نے ان بلند پایہ علماء اور خطباء کی قیادت کو صرف اس لئے ترک کیا کہ قائد اعظم ہندوؤں سے الگ ایک اسلامی مملکت بنانا چاہتے تھے۔ اگر ان کے ہاں اسلام کی بات نہ ہوتی تو مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا اشرف علی تھانوی جیسے بزرگ مسلم لیگ کی

حمايت ہرگز نہ کرتے۔ قائد اعظمؒ اور ان کے ساتھیوں کے بے شمار سہائيات (۱) تقديريہ اس امر کی شاہد ہیں (۱)۔

بہر حال ان باتیان ملک کے ارادے جونہی ہوں تقسیم ملک کے بعد مولانا مودودی کی قیادت میں جماعت اسلامی نے ان کے انہی بیانات کو بنیاد بنا کر اسلامی نظام کے قیام کا مطالبہ شروع کر دیا اور جلد ہی یہ مطالبہ سارے ملک میں پھیل گیا۔ تمام اسلامی طبقات نے اس کی حمایت کی اور مسلم لیگ کی حکومت نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ جماعت اسلامی نے اس کے نقطہ نظر سے نہایت ہی خطرناک کام شروع کر دیا ہے، چنانچہ حکومت نے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے سرکردہ لوگوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ لیکن ان گرفتاریوں سے یہ مطالبہ اور زور پکڑ گیا۔ اس وقت حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی

(۱) لیکن یہ بات اب حجت شدہ حقیقت ہے کہ قاضی اعظم، بالکل اسٹاکہ سیاست چاہتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۴۵ء میں قاضی مسلم ایک کانفرنس میں کہا کہ ہندو میں مسلمان اس لیے پاکستان کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ اپنے تباہیاتیات، تہذیبی ارتقاء، اپنی روایات اور اس کی قانون کے مطابق زندگی بسر کر سکیں (مسٹر جناح کی تقریر میں اور غم میں از جمیل الدین احمد ص ۱۹۱) (پشاور میں سے ایک اخبار کی ریان میں انہوں نے اس بات کی خصوصی طور پر تین اہلی کرائی "سکر خان برادران عبد الغفر خان صاحب نے، اپنے بیانات میں اور انہری ملاقاتوں میں ایک اور ذرا آلودہ پراکیا ہے کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی شریعت کے بنیادی اصولوں اور قرآنی قوانین سے انحراف کر کے یہ بات بھی قطعی طور پر غلط ہے۔ (ڈان ۳۰ جون ۱۹۴۷ء)

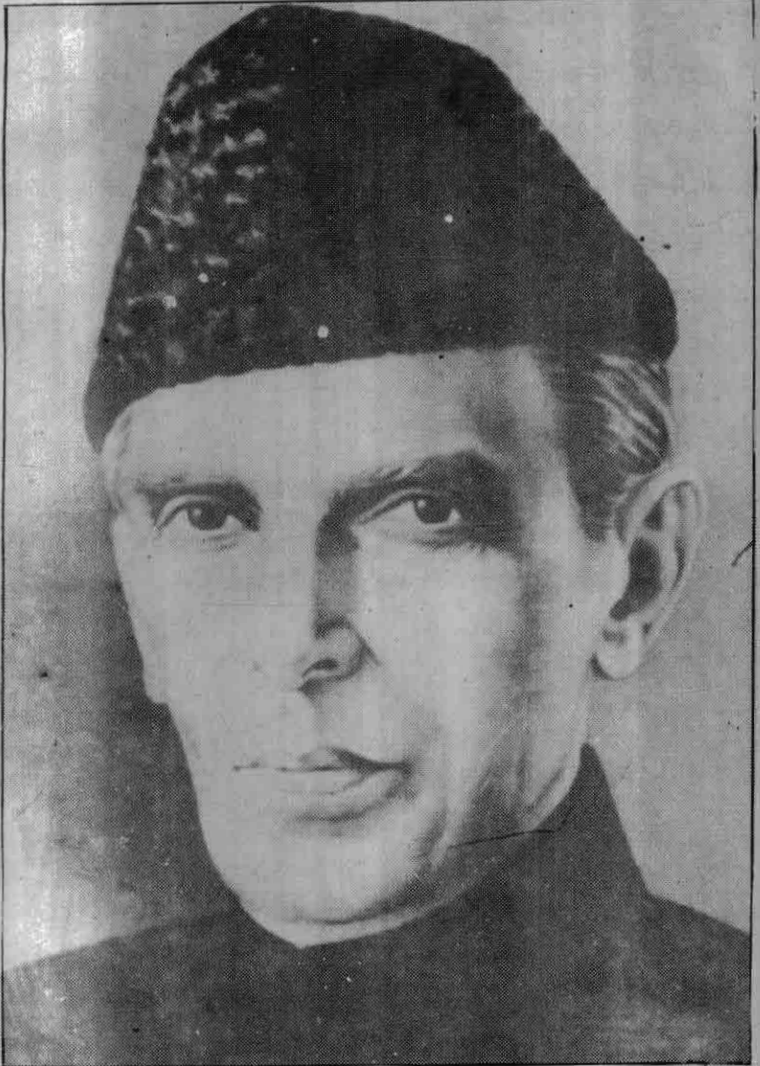
میکم جنوری ۱۹۶۹ء میں یہاں تک ملی ضمن نے اپنے ایک بیان میں کہا "پاکستان ایک مکمل اسلامی ریاست ہو"۔۔۔۔۔ ایک تجربہ کار جواہر لال نہرو نے کہا کہ "تیرہ سو برس پرانے اسلامی اصول ابھی تک کارآمد ہیں" (۱)۔ (۲) اور اس قسم کے بے شمار حوالے معاظرفرمانیں "قادیانی مسئلہ اور اس کے سیاسی، دینی اور تمدنی پہلوؤں کے سوسائٹولوجی و رویہ ہندو طبع، ۱-۱۱، ملک پبلیکیشنز، لاہور، مئی ۱۹۶۶ء صفحات ۱۹۱ تا ۱۹۴)

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ قندہ اسٹیم کے کچھ ٹوہ غرض پیرو کاں اپنی مطلب پر آری کے لیے خواہش میں ایک متناقض طاقت کر رہے ہیں اور لوگوں کو یہ پاور کراتے ہیں کہ دراصل وہ ایک جدید ٹاؤنشی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ اور یہ حقدار ہر چو انہوں نے کہیں ایک فراڈ تھ۔

یعنی خود حامد اقبال کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال، ان کے بارے یہ شوشے پھوٹے ہیں کہ وہ ایک شیلولر ریاست چاہتے تھے اگرچہ کلام اقبال کا ناز و مال ذخیرہ دلوں و خطبہ الہ آباد اس بات کے شاہد ہیں کہ انہوں نے جو کچھ لکھا، کیا ایک بکے سچے مسلمان کی حیثیت سے کہا اور لکھا، سیکولرزم سے انہیں دور کا بھی تعلق نہ تھا، ان کا سارا کلام ایسا ہی اسلام کے لیے ہے۔

اور کچھ دوسرے بالآخر حضرات دستور یہ کے رکن تھے۔ انہوں نے دستور ساز اسمبلی میں اس مطالبے کی حمایت میں زبردست مہم چلائی اور بالآخر لیاقت علی خان نے جماعت اسلامی کے مطالبے کی اساس پر قرار داد مقاصد مرتب کی۔ اس وقت مولانا مودودی ملتان جیل میں تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کی ہدایت پر اس قرار داد کا مسودہ ملتان جیل میں مولانا کے پاس بھجوا دیا گیا۔ مولانا نے اس کی منظوری دی اور یہ مسودہ (Objective Resolution) کی صورت میں دستور ساز اسمبلی نے پاس کیا۔ اس کے بعد آج تک تمام وسائیر میں اس قرار داد کو بطور وسیلہ شامل کیا گیا ہے۔ اور آج تک عوام التماس، حکمرانوں اور عدلیہ نے اس دستاویز کو ایک مقدس اور قابل احترام دستاویز سمجھا ہے۔





قائد اعظم محمد علی جناحؒ

لاہور کا مارشل لا اور مقدمات

پاکستان کی پہلی دستورہ کے سامنے علماء نے ۲۲ نکات کی شکل میں، اسلامی دستور کا ایک مکمل خاکہ پیش کیا لیکن ۱۹۵۲ء میں تحریک ختم نبوت اٹھ کھڑی ہوئی اور اس تحریک کے نتیجے میں لاہور میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا اور فوج نے اس تحریک کو کچل دیا۔ اس دور میں دو اہم مقدمات زیر سماعت آئے اور ان مقدمات سے عدلیہ اور جرنیلوں کے درمیان قانونی کشمکش کا آغاز ہوا (ایک مقدمہ مولانا مودودی کے خلاف تھا اور دوسرا مولانا عہد ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲ کے خلاف)۔

مولانا مودودی کے خلاف مقدمہ

مولانا مودودی کو تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء کو گرفتار کیا گیا۔ ان کے خلاف ضابطہ (۸) لاہور مارشل لا، تعزیرات پاکستان دفعات ۱۵۳ (منافرت پھیلانا) اور ۱۲۳ (۱) (حکومت کے خلاف بغاوت کرنے) کے تحت لاہور کی ایک فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ ۳ مئی ۱۹۵۳ء کو گورنر جنرل پاکستان غلام محمد کراچی سے لاہور آنے۔ اعلان کیا گیا کہ ۶ مئی ۱۹۵۳ء سے مولانا پر مقدمہ چلایا جائے گا گورنر جنرل نے لاہور کے قانونی مایہ نین سے مشورہ کیا جنہوں نے غالباً یہ مشورہ دیا کہ مذکورہ بالا دفعات کے تحت مولانا مودودی کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوتا، چنانچہ گورنر جنرل لاہور سے کراچی



مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

واپس چپے گئے اور وہاں پہنچتے ہی ۹ مئی ۱۹۵۳ء کو ایک آرڈینینس جاری کیا، جس نے فوجی عدالت کو مجاز کیا کہ وہ مارشل لاء کے نفاذ سے دو (۲) ماہ قبل تک کے کسی جرم پر بھی سزا دے سکتی ہے۔ اور اس سزا کے خلاف کسی عدالت میں کوئی چارہ جوئی نہ ہو سکے گی۔ یہ اس لئے کرنا پڑا کہ مولانا پر جو ”قادیانی مسئلہ“ لکھنے پر مقدمہ بنایا گیا تھا وہ مارشل لاء کے نفاذ سے پہلے لکھا گیا تھا اور شائع بھی ہو چکا تھا۔ اس لئے اس آرڈینینس سے اختیار حاصل کیا گیا۔ اس طرح یہ انتظامات کرنے کے بعد ۱۱ مئی ۱۹۵۳ء کو مولانا کو سزائے موت سنائی دی گئی۔ یہ سزا نہایت ہی سرسری سماعت کے بعد عجالت تمام دی گئی۔

یہ سزا اس قدر احمقانہ تھی کہ بادی النظر ہی میں غلط نظر آتی تھی۔ یہ انتہائی سنگین سزا مولانا کو ”قادیانی مسئلہ“ لکھنے اور چھاپنے پر دی گئی تھی یہ فعل خود اس آرڈینینس، یا مارشل لاء کے کسی ضابطے کے تحت بھی جرم نہ تھا۔ کیونکہ نہ اس وقت اور نہ آج تک اس پمفلٹ کو کبھی ضبط کیا گیا۔ نہ یہ بات ثابت کی گئی کہ اس پمفلٹ میں کیا جہیز قابل سزا ہے (اس کتابچے میں مولانا محترم نے صرف وہ تمام حوالے جمع کئے تھے جو قادیانیوں کے ہاں مطبوعہ اور مسلم کتابوں میں شائع شدہ موجود تھے اور جن سے قادیانی خود بھی منکر نہ تھے۔ سزا سنانے کے بعد فوجی عدالت نے ازراہ کرم مولانا محترم کو رجم کی اپیل کی اجازت دی، لیکن انہوں نے قسم کی اپیل کرنے سے عاف اٹھا کر دیا۔

مولانا ووددی کو سزائے موت سناؤنا کوئی معمولی بات نہ تھی، پوری دنیا میں اس کے خلاف احتجاج ہوا اور اس کے نتیجے میں مارشل لاء حکام نے از خود موت کی سزا کو ۱۴ سال کی قید میں تبدیل کر دیا۔





مولانا ابوالکلام آزاد



مولانا عبدالستار نیازی

مولانا عبد الستار خان نیازی کے خلاف مقدمہ

فوجی عدالت نے مولانا عبد الستار خان نیازی کو بھی سزائے موت سنائی تھی۔ انہوں نے اس تحریک کی قیادت کی تھی۔ عدالت نے امیدیل کرنے کا حق دیا، تو نیازی صاحب نے لاہور ہائی کورٹ میں جیس بے جاگی درخواست وائرنگی اور ۳ جولائی ۱۹۵۳ء کو لاہور ہائی کورٹ کے فل بیج نے جو چیف جسٹس محمد منیر، (۱) جسٹس ایس اے رحمان اور جسٹس ایم۔ کیانی پر مشتمل تھا، مولانا عبد الستار خان نیازی میر صوبائی اسمبلی کی درخواست جس بے جا کو رو کرتے ہوئے ایک اہم فیصلہ دیا (مولانا عبد الستار نیازی کو تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۲۴ الف اور مارشل لا آرڈر ۸ بحریہ لاہور کے تحت، مئی ۱۹۵۳ء کو مارشل لا کی فوجی عدالت نے سزائے موت دی تھی، جسے بعد میں ۱۴ سال قید میں تبدیل کر دیا گیا تھا)۔

اس فیصلے میں ججوں نے مارشل لا کی تعریف اور اس کے حدود کا بڑی مفید بحث کی۔ ججوں نے مارشل لا کی اقسام بتاتے ہوئے کہا کہ: مارشل لا کی پہلی قسم وہ ہے جو

(۱) یہ بات قدین نوٹ کریں کہ سٹر جسٹس منیر نے ہیٹھ حدیہ میں نوکر شاہی کے ذہن سے کام کیا۔ اکثر فیصلوں میں حکومتی نقطہ نظر کو پھر افی بخشی۔ تحریک ختم جوت کے بارے میں انہیں فسادات پنجاب کے لیے انکوائری بیج مقرر کیا گیا تھا انہوں نے جس انداز سے اس انکوائری کو سر انجام دیا اور اس سے جو نتائج اخذ کیے اس کی مثال بالکل ایسی ہے جس طرح ایک قاتل کو اپنے مقدمہ قتل میں عدالت کی کرسی پر بیٹھا دیا جائے یا لپک ڈاکو کو خود اپنا مقدمہ سننے کے لیے کرسی پر بیٹھا دیا جائے لار وہ اپنے خلاف الزامات کا فیصلہ دے۔ دیکھئے:

An Analysis of The Munir Report Khurshid ahmad, Karachi 1956.

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

"We cannot therefore, hold that the indemnity ordinance to be invalid." PLD 1956 Lahore P 547

Sentences of confinement by military courts will expire with the expiry of the Martial Law" PLD 1953 Lahore P 540).

1. Martial Law is law and its limits are prescribed by necessity, then not only the crown has the prerogative to proclaim Martial Law but without such proclamation the military can take over where by war, insurrection, rebellion tumult civil authority is deposed, suspended or paralysed, all facts done by the military which or citizen justified by civil law or were dictated by necessity and done in good faith will be protected, even if there be no bill of indemnity, while preventive action for the duration of Martial Law be valid, punitive action will generally be invalid. Martial Law will reverse ipso-facto with of cessation necessity." (PLD 1953) (above, p 539)

۱۰۰
 ۱۰۱
 ۱۰۲
 ۱۰۳
 ۱۰۴
 ۱۰۵
 ۱۰۶
 ۱۰۷
 ۱۰۸
 ۱۰۹
 ۱۱۰
 ۱۱۱
 ۱۱۲
 ۱۱۳
 ۱۱۴
 ۱۱۵
 ۱۱۶
 ۱۱۷
 ۱۱۸
 ۱۱۹
 ۱۲۰
 ۱۲۱
 ۱۲۲
 ۱۲۳
 ۱۲۴
 ۱۲۵
 ۱۲۶
 ۱۲۷
 ۱۲۸
 ۱۲۹
 ۱۳۰
 ۱۳۱
 ۱۳۲
 ۱۳۳
 ۱۳۴
 ۱۳۵
 ۱۳۶
 ۱۳۷
 ۱۳۸
 ۱۳۹
 ۱۴۰
 ۱۴۱
 ۱۴۲
 ۱۴۳
 ۱۴۴
 ۱۴۵
 ۱۴۶
 ۱۴۷
 ۱۴۸
 ۱۴۹
 ۱۵۰
 ۱۵۱
 ۱۵۲
 ۱۵۳
 ۱۵۴
 ۱۵۵
 ۱۵۶
 ۱۵۷
 ۱۵۸
 ۱۵۹
 ۱۶۰
 ۱۶۱
 ۱۶۲
 ۱۶۳
 ۱۶۴
 ۱۶۵
 ۱۶۶
 ۱۶۷
 ۱۶۸
 ۱۶۹
 ۱۷۰
 ۱۷۱
 ۱۷۲
 ۱۷۳
 ۱۷۴
 ۱۷۵
 ۱۷۶
 ۱۷۷
 ۱۷۸
 ۱۷۹
 ۱۸۰
 ۱۸۱
 ۱۸۲
 ۱۸۳
 ۱۸۴
 ۱۸۵
 ۱۸۶
 ۱۸۷
 ۱۸۸
 ۱۸۹
 ۱۹۰
 ۱۹۱
 ۱۹۲
 ۱۹۳
 ۱۹۴
 ۱۹۵
 ۱۹۶
 ۱۹۷
 ۱۹۸
 ۱۹۹
 ۲۰۰

(۲) - (۱) کے لئے مقررہ ہے

ہوتے ہی خود مارشل لا بھی ختم ہو جائے گا (۱) اور اس کے تحت دی ہوئی سزائیں موقوف تصور ہوں گی (۲)۔

اس فیصلے میں جج صاحبان نے حکومت برطانیہ کی ان ہدایات پر مفصل بحث کی ہے جو ۱۹۴۴ء میں، اس غیر ملکی حکومت نے سول نافرمانی کی صورت میں اپنی فوج کو جاری کی تھیں۔ ان ہدایات میں ہندوستانی فوج کو بڑی سختی سے، کوئی ایسا قدم اٹھانے سے منع کیا گیا تھا جو ضرورت سے زیادہ ہو یا جس کی ضرورت کو عدالت میں ثابت نہ کیا جاسکتا ہو لیکن آخر میں محض اس لئے درخواست منظور کرنے سے اپنی معذوری کا اظہار کیا کہ حکومت پاکستان نے ۹ مئی ۱۹۵۳ء کو اپنے غیر معمولی گزٹ میں ایک فرمان برأت جاری کر دیا ہے۔ جسکے مطابق مارشل لا کے دوران میں اٹھائے جانے والے تمام اقدامات کو، قانونی تحفظ دیدیا گیا ہے، چنانچہ مجوں نے قرار دیا کہ چونکہ یہ فرمان، قانون حکومت ہند ۱۹۴۵ء کے تحت حاصل شدہ اختیارات کے مطابق جاری ہوا ہے اس لئے وہ آرڈینینس کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں دے سکتے (۳) فیصلہ دینے والے مجوں میں جج جسٹس محمد شیر شامل تھے، جس طرح کہ خود بالائی کورٹ نے طویل بحث کی یہ فرمان ہندوستان، پاکستان اور امریکہ کے جملہ قوانین کے خلاف تھا۔ پھر خود عدالت نے تسلیم کیا کہ

(۱)

"If Martial Law is law and its limits are prescribed by necessity, then not only the crown has the prerogative to proclaim Martial Law but without such proclamation the military can take over where by war, insurrection, rebellion tumult civil authority is deposed, suspended or paralysed all acts done by the military which or either justified by civil law or were dictated by necessity and done in good faith will be protected, even if there be no bill of indemnity, while preventive action for the duration of Martial Law be valid, punitive action will generally be invalid. Martial Law will cease ipso-facto with of cessation necessity." PLD 1953 Lahore, P 539

(۲)

"Sentences of confinement by military courts will expire with the expiry of the Martial Law." PLD 1953 Lahore P. 540.

(۳)

"We cannot, therefore, hold that the indemnity ordinance to be invalid." PLD 1953 Lahore P 547.

حکومت برطانیہ اور اسکی ماتحت حکومتوں اور نو آبادیوں میں ایک درجن سے بھی زیادہ قوانین برأت (Indemnity Acts) نافذ کئے گئے ہیں لیکن کسی میں بھی مارشل لا دور میں دی گئی تعزیری سزاؤں کو تحفظ نہیں دیا گیا۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے یہ معصومان کن اصولی قوانین پر ایمان رکھتے تھے، اگر وہ ایہملو سیکسن قانونی نظام کے پیرو تھے تو پھر ان کا فرض تھا کہ وہ درخواست گذار کی داد رسی کرتے کیونکہ خود ان کی آراء اور تحقیقات کے مطابق کسی قانون برأت (Indemnity Acts) میں یہ حرکت نہیں کی گئی۔ اور اگر وہ اسلامی نظام کے مؤمن تھے جس طرح ہماری ریاست کے بایاں نے، اس نظام کی اساس کو قرار داد مقاصد میں مضبوط کر دیا تھا، تو بھی ان کا فرض تھا کہ وہ اس قانون برأت کو خاطر میں نہ لاتے، مگر افسوس ہے کہ ہمارے ان مجبوں نے ”گرہ کشتن روز اول“ کے اصول پر لاپور کے مارشل لا پر بھروسہ کر لیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک عدلیہ اور مارشل لا حکام کے ورمیاں قانون انصاف کی بالادستی اور قانون جنگل، مارشل لا کی بالادستی کا تنازعہ چل رہا ہے اور اب یہ بات نہایت ہی مشکل ہو گئی ہے کہ کوئی قانونی فورم ملکی قوانین کی حیثیت بحال کر سکے۔ اسلئے کہ ہماری عدلیہ نے طالع آزمائوں کے لئے طالع آزمائی کو قانونی جواز فراہم کیا ہے۔ بعد کے ادوار میں آپ پڑھیں گے کہ عدلیہ نے اس مشکل سے بھٹنے کی بڑی کوشش کی، لیکن جو راہ و رسم ایک بار چل گئے اس کا بند کرنا پھر بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔



39/175

مولوی تمیز الدین کیس

اس کے بعد دستور سازی کا کام بڑی سست رفتاری سے شروع کیا گیا اور دستور ساز اسمبلی میں تقریباً سات سال بعد ۱۹۵۲ء میں ناظم الدین کمیٹی کی مرتبہ دستوری سفارشات پیش کی گئیں اور ان کی روشنی میں ستمبر ۱۹۵۲ء میں وہ دستور مرتب ہوا جو کافی حد تک علماء کے ۲۲ دستوری نکات کی اساس پر مبنی تھا اور اس کو دستور ساز اسمبلی نے پاس بھی کر دیا صرف اس پر صدر اسمبلی کے اور ارکان کے دستخط ہونا باقی تھے۔ مگر حکومت پر چونکہ میکولر اور لادین عناصر کا قبضہ تھا اور گورنر جنرل سمیت بیورو کریسی اور فوج پر بھی بے دین اور مغریت زدہ افراد چھائے ہوئے تھے نیز بین الاقوامی قوتیں بھی کسی اسلامی ملک میں اسلامی دستور و قانون کے شفاؤ کے حق میں نہ تھیں، اس لئے ظلام احمد نے سرے سے دستوریہ ہی کو توڑ دیا (۱)۔

اس کارروائی کے خلاف مولوی تمیز الدین نے سندھ ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کیا جو اُن کے حق میں فیصلہ ہوا، لیکن فیڈرل کورٹ میں جسٹس منیر نے حکومت کی اپیل پر اپنا وہ مشہور (۲) اور تاریخی فیصلہ دیا جس کے نتیجے میں آج تک اس ملک میں صحیح جمہوری حکومت قائم نہیں ہو سکی اور نہ آج تک صحیح معنوں میں اس ملک میں

(۱) حکم (Proclamation) از جانب گورنر جنرل بھروسہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۲ء

(۲) پی ایل ڈی ۱۹۵۵ء صفحہ ۹۶ مولوی تمیز الدین بنام حکومت پاکستان

(۳) پی ایل ڈی ۱۹۵۵ء فیڈرل کورٹ ص ۲۴۰

تحفہ فیصلات یہ ہیں کہ ۱۹۵۲ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ایسے قانونی اور دستوری اقدامات کئے جن کے نتیجے میں پاکستان میں جمہوریت اور بنیادی حقوق کی مستحکم اساس رکھ دی گئی۔ دستوریہ نے ۶ جولائی ۱۹۵۲ء کو قانون حکومت ہند بحریہ ۱۹۳۰ء میں ایک اہم ترمیم کی جس کے ذریعہ دفعہ ۲۲۲ الف کا اضافہ کیا گیا۔ اور تمام ہائی کورٹوں کو حکومت کے خلاف رٹ جاری کرنے کے اختیارات دئے گئے۔ یہ قانون صدر دستوریہ کے دستخطوں سے جاری ہوا اور اسے ایک ”دستوری قانون“ ہونے کی وجہ سے گورنر جنرل کی منظوری کے لئے نہ بھیجا گیا (۱)۔ ایک دوسری ترمیم کے ذریعے ہزارہ کے جدید ملحق علاقے کو غائبہ کی دی گئی اور یہ ترمیم بھی دستوریہ کے صدر کی جانب سے جاری ہوئی اور اسے بھی گورنر جنرل کو منظوری کے لئے نہ بھیجا گیا (۲) دستوریہ نے ایک اور ترمیم کے ذریعے دفعہ ۲۹۰ الف کے تحت وہ اختیارات ختم کر دیے جو گورنر جنرل کو حاصل تھے اور قانون حکومت ہند اور قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء میں ایک اساسی ترمیم کر کے پاکستان کی دستوریہ کو دستور سازی کے معاملات میں مکمل اختیار اعلیٰ عطا کر دیا اور یہ وضع کیا گیا کہ دستور ساز اسمبلی کو مکمل اختیار حاصل ہے کہ وہ وفاق پاکستان کے لئے جو دستور بھی چاہے وضع کرے۔ اور طے پایا کہ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء یا قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء یا کسی اور قانون میں اس کے خلاف اگر کوئی دفعہ بھی پائی جاتی ہو تو کالعدم تصور ہوگی۔ یہ اہم دستوری ترمیم بھی ۲ اگست ۱۹۵۲ء کو صدر دستوریہ کے دستخطوں سے جاری ہوئی؟

اور اُسے بھی گورنر جنرل کے پاس منظوری کے لئے نہ بھیجا گیا۔

(۱) فی ایل ڈی ۱۹۵۳ء، مرکزی قوانین ص ۱۵۲۔

102-111-1-1-1-1-1 (r)

[illegible]

LSF (r)

ظاہر ہے کہ اپنے خاص انداز رکھنے والی بیوروکریسی جس کی سربراہی غلام محمد جیسا گورنر جنرل کر رہا تھا اور جس کے ساتھ اس وقت کے فوجی سربراہ جنرل ایوب خان بھی مکمل تعاون کر رہے تھے نیز سکندر مرزا جو اس وقت بیوروکریسی کے بااثر فرد تھے اور پوری طرح غلام محمد کے پشتیبان تھے یہ لوگ ٹھنڈے میٹھوں کسی طرح بھی ایک عوامی ادارے کو اس قسم کے مکمل اقتیارات کیسے دے سکتے تھے چنانچہ بیوروکریسی نے اس سلسلہ میں صدر و ستوریہ کے ساتھ خط و کتابت کی کہ وہ ان قوانین کو گورنر جنرل کے پاس منظوری کے لئے بھیجیں لیکن صدر و ستوریہ نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت کے کمانڈر ان چیف ایوب خان اور تمام اعلیٰ افسران کی سازش سے گورنر جنرل نے پاکستان کی پہلی و ستوریہ کو توڑ دیا، جس پر، جماعت اسلامی پاکستان کے مکمل اخلاقی اور ملی تعاون سے، مولوی تیز الدین نے سندھ چیف کورٹ میں گورنر جنرل غلام احمد کے دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کے اس اقدام کو چیلنج کر دیا کیا۔

اس مقدمے میں فیصلہ طلب امور یہ تھے۔

(۱) یہ کہ کیا و ستوریہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ قانون یا دستور بنائے اور گورنر جنرل سے تصدیق کرائے بغیر خود نافذ کر دے؟ سندھ چیف کورٹ کے ججوں کی اکثریت نے یہ فیصلہ دیا کہ دستور ساز اسمبلی مکمل طور مقتدر اعلیٰ ہے۔ وہ قانون آزادی ہند کو بھی منسوخ کر سکتی ہے، وہ قانون حکومت ہند کو بھی منسوخ کر سکتی ہے اور اُسے یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ یہ قانون بنائے کہ کسی قانون کا از جانب گورنر جنرل منظوری دینا ضروری نہیں (۱)۔ و ستوریہ قانون سازی کے معاملے میں مقتدر اعلیٰ (Sovereign) ہے۔

(۱) دیکھئے مولوی تیز الدین بنام مرکزی حکومت - پی ایٹل ڈی ۱۹۵۵ء سندھ ص ۱۹۶ تا ۱۹۹ جسٹس عمر بخش لکھتے

(ب) اس مقدمہ میں دوسرا اہم سوال یہ تھا کہ آیا گورنر جنرل، تاج برطانیہ کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے دستور ساز اسمبلی کو توڑ سکتا ہے؟ اس سوال پر سندھ چیف کورٹ کے تین ججوں: جسٹس محمد بخش۔ جسٹس کانسٹن ٹین (Constan Tine) اور جسٹس وہلانی نے بڑی تفصیل سے بحث کی اور ان تینوں نے یہ فیصلہ دیا کہ تاج برطانیہ کے اختیارات کو قانون حکومت ہند مجریہ ۱۹۳۵ء اور قانون آزادی ہند مجریہ ۱۹۴۷ء نے محدود کر دیا ہے۔ اور اب گورنر جنرل قانون آزادی ہند کی دفعہ (۵) کے تحت صرف محدود اختیارات استعمال کر سکتا ہے۔ اگر اُسے دستور یہ کو توڑنے کا اختیار دیا جانا مطلوب ہوتا تو دفعہ (۵) اسے یہ اختیارات دے دیتی لیکن دفعہ (۵) کا سکوت عذا ہے۔ اس لئے دستور یہ نے خود اپنے توڑنے کے لئے رول نمبر ۱۰ وضع کیا جس کے مطابق وہ دو تہائی کی اکثریت سے اپنے آپکو توڑ سکتی ہے (۱)۔ جسٹس محمد بخش نے کہا کہ قوانین آزادی ہند میں سرے سے کوئی ایسی تجویز ہی نہیں ہے کہ گورنر جنرل دستور یہ کو توڑ سکے۔ جبکہ گورنر کو کیشن کرنے والے تاج برطانیہ نے دستور یہ کو مکمل آزادی، اقتدارِ اعلیٰ اور تحفظ دیا ہے (۲)۔ جسٹس کانسٹن ٹین نے تو مزید یہ بھی کہا کہ اگر یہ اختیارات استعمال کر سکتی ہے تو صرف برٹش پارلیمنٹ کر سکتی ہے اور اگر برٹش پارلیمنٹ نے یہ اختیارات گورنر جنرل کو دینے تجھے تو وہ قانون آزادی ہند میں اس کے لئے کوئی دفعہ تجویز (۳) کرتی۔ اور واضح طور پر یہ اختیار دیا جاتا۔

غرض ان دو اہم اور دوسرے ضمنی بحث پر ان مجوں نے ۸۴ صفحات پر مشتمل طویل

(۱) پی ایل آئی ۱۹۵۵ء سندھ مس نمبر ۱۰۔ جسٹس وہلانی لکھتے ہیں

The result is that the prerogative to dissolve is governed by express provision of S.5 of Indian Independence Act and that section does not enable the Governor General to dissolve the Constituent Assembly.

(۲) لکھتے ہیں

"There is no provision in Independence Act for the dissolution of Constituent Assembly

(۱) دیکھئے پی ایل آئی ۱۹۵۵ء لیڈر کورٹ ص ۲۴۰ تا ۲۴۸

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

فیصلہ دیا۔ جس میں گورنر جنرل غلام محمد کے فرمان کو کالعدم قرار دیا گیا اور انہیں ہدایت کی گئی کہ صدر، ستوریہ اور دستور کے عمل اور کاروائی میں محکمہ نہ ہوں اور سکندر مرزا اور ایوب خان وغیرہ دوسرے وزراء کو ممانعت کر دی گئی کہ وہ بطور وزیر کام کرنا بند کر دیں۔

اے کاش! کہ اس فیصلے کو فیڈرل کورٹ نے بحال رکھا ہوتا! اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو آج ہم چالیسویں یوم آزادی پر بھی جمہوریت کے لئے نہ ٹرپتے اور اس ملک میں کسی تحریک بحالی جمہوریت کی ضرورت نہ ہوتی، بلکہ آج اس ملک میں آٹھواں جنرل الیکشن ہوتا اور مستحکم سیاسی پارٹیاں، بن چکی ہوتیں اور مزید یہ کہ ملک کے نہ ٹکڑے ہوتے اور نہ ایسی تحریکات ہوتیں جو اس کے مزید ٹکڑے کرنے کے درپے ہیں لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اب ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ ہمارے فیڈرل کورٹ کے سربراہ مسٹر محمد منیر صاحب نے اس مقدمہ کے خلاف حکومت کی اپیل پر کیا فیصلہ دیا۔ مقدمہ فیڈریشن آف پاکستان بنام تمیز الدین خان میں، مسٹر جسٹس محمد منیر نے یہ فیصلہ الٹ دیا اور اپنے ۱۲۸ صفحات کے طویل فیصلے میں سندھ چیف کورٹ کے فیصلے کے زمریں اصولوں کو یکسر بدل دیا۔ علمی لحاظ سے یہ فیصلہ قانونی ریسرچ اور تحقیق کے میدان میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں مسٹر جسٹس مرحوم کو اٹھ معاف کرے انہیں اسلامی نظام زندگی، اسلام کے وسیع ذخیرہ قانون اور اسلام کی طویل تاریخ میں کوئی مثال یا نظیر نظر نہ آئی جس کا وہ استہزاء کرتے۔ انہوں نے ایٹلو سیکنس نظام قانون کو وحی کا درجہ دے کر یہ کہا کہ چونکہ تاج برطانیہ کو یہ اختیارات حاصل رہے ہیں کہ وہ دستوریہ یا مقننہ کو توڑ دے، اس لئے اس کے مقرر کردہ گورنر جنرل غلام محمد کو بھی ان کے نمائندے کی حیثیت سے یہ اختیارات حاصل ہیں حالانکہ اس وقت ہماری دستوریہ نے قرارداد مقاصد پاس کر کے پاکستان کا مقننہ راعلیٰ اللہ رب العالمین کو قرار دے رکھا تھا، جسٹس منیر اگر قرارداد مقاصد کا راستہ اختیار کرتے تو کر سکتے تھے، بلکہ پاکستان کے چیف جسٹس کی حیثیت سے یہ ان کا فرض منصبی تھا۔ اس مقدمے میں جسٹس کارنیلز نے دوسرے ججوں سے اختلاف کرتے ہوئے

اپنا طلیعہ فیصلہ دیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر ۲۲ دونوں فریقوں کے مؤقف اور دلائل کو پیش کر دیا جائے۔ اس سے قارئین کو اندازہ ہو گا کہ جسٹس کارنیلس جو ایک عیسائی تھے ان کا مؤقف اسلامی اصولوں اور امت مسلمہ کے نقطہ نظر اور اعتقاد اور مفاد کے کس قدر قریب تھا اور دوسرے مسلمان چار ججوں جسٹس منیر، جسٹس اکرم، جسٹس محمد شراف اور جسٹس رحمان کا مؤقف کس قدر بودا اور اسلام اور امت اسلامیہ کے مفاد کے خلاف تھا۔ حالانکہ یہ حضرات بفضل خدا مسلمان تھے۔ اور جسٹس کارنیلس کے مقابلے میں اسلام سے قریب تر اور زیادہ واقف تھے۔

جسٹس منیر کے دلائل کا خلاصہ:

چونکہ دستور سازی بھی ایک قسم کی قانون سازی ہے اور ہر قانون کو قانون کا درجہ دینے کے لئے اس کی منظوری گورنر جنرل سے لینا ضروری ہے اس لئے اگرچہ دستور ساز اسمبلی نے دستور ۱۹۷۳ء میں دفعہ ۲۲۳ (۱) کا اضافہ کر کے پاکستان کے عوام کو حکومت کے خلاف رٹ کے اختیارات دے دیے ہیں، لیکن چونکہ انکی منظوری گورنر جنرل نے نہیں دی ہے اس لئے وہ غیر مؤثر ہے۔ اور برطانیہ میں چونکہ بادشاہ کے پاس ہی ایسے اختیارات ہیں اور چارے ہاں گورنر جنرل چونکہ تاج برطانیہ کا نمائندہ ہے، اس لئے اُسے بھی یہ اختیارات حاصل (۱) ہیں کہ اس کی منظوری کے بعد کوئی چیز قانونی حیثیت حاصل کر سکتی ہے اس لئے کہ دستور سازی اور قانون سازی بھی ایک طرح کی حکمرانی ہے اور گورنر جنرل کو دستوری معاملات میں بھی اختیار رد و قبول حاصل ہو گا۔

اگر دستوریہ یہ سمجھتی ہے کہ اُسے اقتدار اعلیٰ حاصل ہے اور یہ کہ وہ گورنر جنرل کی

(۱) آزادی سے قبل تو یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے، لیکن آزادی کے بعد تلج برطانیہ کے غلامدے کو اصل حکمران سمجھ کر اُسے دستور سازی کے معاملات میں بھی دستوریہ کے اوپر لاکر بٹھاتا، نہ اُردئے دستور ضروری تھا، نہ ہمارے ملکی مفاد میں تھا۔ سٹر جسٹس محمد منیر نے اینگلو سیکسن لائبریری میں بڑی دیرسچ فرمائی لیکن انہیں امریکہ کی تاریخ آزادی کا مطالعہ نہ فرمایا، جو قانوناً آج تک انگلستان کی کالونی ہے، لیکن آزاد ہے۔ اگر تلج برطانیہ کا نمائندہ ۱۹۵۳ء میں بھی ہے تو یہ حکمران تھا تو برطانیہ نے آزادی کے نام سے وہ کیا چیز تھی جو عوام اور دستوریہ کو سنبھال کی۔

منظوری کی محتاج نہیں ہے تو وہ احمقوں کی جت میں رہتی ہے (۱) اگر قانوناً گورنر کی منظوری ضروری ہے، تو وہ تمام قوانین کا اعدام ہو جاتے جن پر گورنر جنرل کے دستخط نہ ہوں۔ چاہے یہ فیصلہ بہت مفید ہو یا تباہ کن ثابت ہو۔ گورنر جنرل کو شاہ برطانیہ نے شاہ متیکم برطانیہ نے مقرر کیا اور وہ ان کا نمائندہ ہے اور قانون آزادی ہند کی دفعہ ۵ کے مطابق حکومت وہ کرے گا۔ اور یہ اختیار شاہ کو حاصل ہے کہ شاہ اختیار (Kings prerogative) استعمال کرے لہذا اس ملک کے اندر یہ اختیار اس کے ایجنٹ کو بھی حاصل ہو گا، اگرچہ قانون حکومت ہند (۱۹۳۵ء) اور قانون آزادی ہند (۱۹۴۷ء) میں ان اختیارات کی تصریح نہ کی گئی ہو۔ سوال یہ ہے کہ اگر بقول فاضل جج صاحب تمام شاہان اختیار، آزادی کے بعد بھی شاہ یا شاہ بانو کے ایجنٹ کو حاصل ہیں اور ریاست کا کوئی ادارہ، عدلیہ مقننہ اور انتظامیہ مکمل طور سے شاہ برطانیہ یا اس کے ایجنٹ کے تابع امر ہے، تو اقتدار اعلیٰ نام کی وہ کیا چیز ہے جو برطانیہ نے ہندوستان کی دو خود مختیار حکومتوں کو منتقل کی تھی اور ان کو خود مختار مملکتیں کیسے کہا گیا۔

غرض یہ تھے جناب جسٹس محمد منیر صاحب کے دلائل مختصر ان کے ہی الفاظ میں۔

Apart from these powers, it has no other powers and it lived in fool's paradise if it was ever seized with the notion that it was a sovereign body in the state.

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

(P.244) PLD 1955 F.C.

جناب جسٹس کارنیلس کے دلائل

اس مقدمہ میں جسٹس کارنیلس نے دوسرے ججوں سے اختلاف کیا اور انہوں نے جو نو بدورت دلائل پیش کئے ہیں ان کو بھی مختصر ان جی کے الفاظ میں پیش کرتا ہوں

”قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء کے ذریعے ہندوستان کے جن دو ممالک کو آزادی دی گئی ہے ان کے لئے اس قانون میں لفظ دو (۲) آزاد ممالک (Independent Dominions) استعمال کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک ملک پاکستان میں جو گورنر جنرل مقرر کیا گیا ہے اسکی صرف یہ حیثیت ہے کہ اسے حکومت پاکستان کی سفارش پر مقرر کیا گیا ہے۔ اسے وہ اختیارات حاصل نہیں جو تاج برطانیہ کو حاصل ہوتے ہیں۔ تقرری کے پروانہ میں تاج برطانیہ نے اس پر کوئی ڈیوٹی عائد نہیں کی۔ صرف یہ کہا ہے کہ وہ تاج کا وفادار رہے گا۔ ہاں اس پر یہ ڈیوٹی ضرور عائد کی گئی ہے کہ وہ دستور پاکستان کو بھی ہو، اس کا بھی وفادار رہے گا (یعنی دستور یہ جو بھی بناوے) اور دستور یہ کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے جو تاج برطانیہ کے کسی حکم کے تحت وجود میں آیا ہو۔ میرے خیال میں یہ ایک مافوق الحد دستور ادارہ ہے اور یہ مافوق القانون ذرائع سے وجود میں آیا ہے، تاکہ وہ بلند و برتر مقصد یعنی دستور سازی کو پورا کرے۔ اس کے اختیارات کا منبع اسکی ذات ہے اور اسکی ذات عوام کے ناقابل شکست ارادے سے وجود میں آئی ہے (۱)۔ پاکستان کی دستوریہ دستوری معاملات میں برطانوی پارلیمنٹ کی طرح ہے جس

(۱) دارا کارنیلس کے خوبصورت الفاظ میں پڑھیے:

The Constituent
Parliament.

It is in my opinion, to be regarded as a body created by a supra legal power to discharge the supra-legal function of preparing a constitution for Pakistan. Its power in this respect, belonged to itself inherently by virtue of its being a body representative of the will of the people in relation to the future mode of Government. PLD 1953 F.C (P. 246)

پر کوئی چیک نہیں ہے۔ لاء منسٹری کے سرکاری افسر مسلسل یہ زور لگاتے آئے ہیں کہ دستوریہ کی پاس کردہ دستوری دفعات کی منظوری لینا ضروری ہے، لیکن پاک دستوریہ کبھی اس رائے کو خاطر میں نہیں لاتی اور اس نے اپنے رولز آف پروسیجر میں رول ۶۲ وضع کر کے واضح طور پر دستوری دفعات کی از جانب گورنر منظوری کو غیر ضروری قرار دیدیا ہے دستوریہ آزاد پاکستانی ریاست کا ایک عضو ٹیسی ہے۔ اس لئے میں اسے گورنر جنرل سے مافوق قرار دیتا ہوں۔ ایک تو اس لئے کہ وہ مقتدر اعلیٰ ہے۔ دوسرے اس لئے کہ جس قانون (قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء) کے ذریعے گورنر جنرل کو اختیارات دیے گئے وہ خود دستوریہ کے ذمہ میں ہے۔ وہ اسے کسی وقت بھی ختم کر سکتی ہے۔ اور آج تک انتظامیہ نے بھی دستوریہ کی اس بالا دستی کو قبول کیا ہے (افسوس ہے کہ جناب محترم جسٹس منیر صاحب نے عدالت میں بیٹھ کر اسے فوج کیا) انتظامیہ اور خود گورنر جنرل کو علم تھا کہ دستوریہ نے رول ۶۲ پاس کر کے منظوری کا چکر ختم کر دیا ہے۔ اور مسلسل سات سال تک بے چوں و چرا تمام اجزائے ریاست اسے درست تسلیم کرتے رہے۔ اس اصول کے تحت صوبوں میں انتخابات ہو چکے ہیں اور عوام کو مفید قانونی حقوق مل چکے ہیں۔ اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ دستوریہ کو گورنر جنرل کی منظوری کا اب سات سال بعد پابند کیا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ دستوریہ سے اختیارات چھینے جا رہے ہیں (۱)

یہ بات اب ایک تاریخی حقیقت ہے کہ فیڈرل کورٹ کے مسلمان ججوں نے مسٹر جسٹس کارنیلیس کے ان زورس و لائل کو رد کر دیا اور انہوں نے دستور سازی کے کام کو اس طرح پافسادہ راستے پر ڈال دیا کہ آج تک اس ملک میں دستور سازی بانی پڑ اطفال بنی ہوئی ہے۔ فیڈرل کورٹ کے مسلم جج صاحبان اگر دستوریہ کو وہ مقام دیتے جو اس کافی الواقع مقام تھا اور جسٹس کارنیلیس اسے دے رہے تھے تو ۱۹۵۵ء میں پاکستان کا جو

(کارنیلیس کے الفاظ میں)

This would be to usurp the function of the Constituent Assembly. To impose such a requirement upon laws of constitutional nature made by a Constituent Assembly would be a direct affront to the position and authority of that body. PLD 1955 F.C (P. 248)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

دستور تیار ہو چکا تھا وہ مستقل طور پر قائم رہتا اور کوئی جرنیل یا کوئی طالع آزما کبھی اُسے توڑ نہ سکتا اور نہ اس ملک میں وہ طویل کھیل کھیلا جاسا جو بعد کے ادوار میں دستور سازی کے نام سے کھیلا گیا۔

ہاں یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ یہ شائر ہونے کے بعد منیر صاحب نے برملا اپنی غلطی کو تسلیم کیا، لیکن جب چڑیاں چمک گئیں کھیت۔ اس سلسلے میں مرحوم قدرت اللہ شہاب فرماتے ہیں:

فیڈرل کورٹ نے غلام محمد کی کھودی ہوئی اس قبر پر جو قانونی پل تعمیر کیا وہ Law of Necessity (قانونی ضرورت) کے ستون پر کھڑا کیا گیا تھا۔ قانون کی یہ شاخ ہمارے امور سلطنت میں پہلی بار ۱۹۵۵ء میں داخل ہوئی۔ اور بیس پچیس برس میں پھل پھول کر یہ ایسا تومند درخت بن گئی جسکے سائے کے نیچے دپ کر دوسرے بہت سے قوانین کی باڑھ مار گئی۔

جس زمانے میں یہ ریفرنس فیڈرل کورٹ کے زیر غور تھا میں نے دیکھا کہ میرا ڈپٹی سیکرٹری فرخ امین ہر دوسرے سے روز مجھے بتائے بغیر لاہور آ جا رہا تھا۔ ایک روز میں نے اسے ڈانٹا کہ میری اجازت کے بغیر وہ اتنی بار لاہور کیوں آ جا رہا ہے؟ اسنے صاف گوئی سے کام لے کر مجھے بتایا کہ وہ گورنر جنرل کا کوئی خفیہ پیغام کوڈ ورڈز (Cod words) کی صورت میں چیف جسٹس مسٹر منیر کے پاس لے جاتا ہے۔ اور وہاں سے اس طرح کوڈ الفاظ میں چیف جسٹس کا پیغام گورنر جنرل کو دے دیتا ہے۔

فرخ امین نے مزید بتایا کہ غلام محمد صاحب کا تاکید حکم ہے کہ وہ یہ بابت کسی کو ہرگز نہ بتائے۔ مجھے معلوم نہیں کہ گورنر جنرل اور فیڈرل چیف جسٹس کے مابین اس خفیہ پیغام رسانی کی کیا نوعیت تھی اور نہ ہی یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اس باہمی خفیہ پیغام رسانی نے فیڈرل کورٹ کے فیصلہ پر کوئی اثر ڈالا بھی تھا یا نہیں۔ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسے موقع پر مملکت کے سربراہ اور عدلیہ کے سربراہ کا آپس میں خفیہ رابطہ قائم کرنا دونوں کو زیب نہ دیتا تھا (۱)۔

(۱) شہاب ناز، منصف قدرت اللہ شہاب مطبوعہ لاہور طبع اول ص ۶۵۳ - ۶۵۴



سید عطاء اللہ شاہ بخاری

دوسرا باب

پاکستان کی دوسری دستوریہ اور ۱۹۵۶ء کا دستور

- دوسو کیس اور ۱۹۶۲ء کا دستور

- ۱۹۶۲ء کا دستور اور اسلام

- جسٹس محمد شفیع کا فیصلہ اور منصب رسالت نمبر

- ضیاء الرحمن کیس سپریم کورٹ میں



قیدلہ مارشل ایوب خان

پاکستان کی دوسری دستوریہ اور ۱۹۵۶ء کا دستور

جسٹس منیر کے فیصلے کے بعد ایک نئی دستوریہ بنائی گئی ، جسے صوبائی اسمبلیوں نے منتخب کیا، اس وقت فوج اور میور و کریسی کا قومی زندگی کے تمام شعبوں پر غلبہ تھا ۔ غلام محمد کے بعد اب سکندر مرزا ملک کا گورنر جنرل تھا جب ۱۹۵۶ء کا دستور مرتب ہوا تو چونکہ اذ روئے قانون اس وقت تک دستور نہ بن سکتا تھا جب تک اس پر گورنر جنرل ، مشقوری کے دستخط نہ کرے ، اس لئے سکندر مرزا نے اس پر تب دستخط کئے جب اس کی صدارت کے بارے میں بات مان لی گئی لیکن سکندر مرزا اور محمد ایوب خان اس پر بھی راضی نہ ہونے ۔ یہ لوگ مسلسل یہ سوچتے رہے کہ کس طرح اس دستور کو ختم کر کے دوبارہ مکمل طور پر شخصی حکومت قائم کر دی جائے جس کے وہ کرتا دھرتا ہوں چنانچہ ٹھیک اس وقت جبکہ ملک کے اندر عام انتخابات کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں، ان حضرات نے ۱۹۵۶ء کے دستور کو اچانک ختم کر دیا اور سکندر مرزا جو سول میور و کریسی کا نمائندہ تھا وہ خود اور ایوب خان جو فوجی میور و کریسی کا نمائندہ تھا وہ پیٹ مارشل لا ایڈمنسٹریشن کیا ۔ چند دنوں بعد ایوب خان نے سکندر مرزا کو بھی چلتا کیا اور خود سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔

۱۹۵۶ء کے دستور کی اسلامی دفعات اور شریعت کی بالادستی

۱۹۵۶ء کے دستور میں قرار واد مقامہ کو بطور مقدمہ (Preamble) شامل کیا گیا تھا اور ان دفعات میں جن کا تعلق سٹیٹ پالیسی سے تھا یہ ہدایت کی گئی تھی کہ ریاست قرآن و سنت کی تعلیم کو ملحوظ رکھے گی اور ایسی حد ایئر اختیار کرے گی، جن کے نتیجے میں مسلمانانِ پاکستان قرآن و سنت کے مطابق زندگی بسر کر سکیں، لیکن اگر ریاست یا حکومت یہ کام نہ کرے تو کیا ہو گا؟ اس کے بارے میں یہ دستور خاموش تھا اور عوام الناس کے لئے کوئی ایسی راہ نہ تھی جس کے ذریعے وہ سٹیٹ پالیسی کے خلاف چلنے والی حکومت کو ہدایت کے لئے کوئی کارروائی کر سکیں (دیکھئے دفعات ۲۲ تا ۳۱ دستور پاکستان ۱۹۵۶ء) اس کے علاوہ دفعات ۱۹۷ اور ۱۹۸ میں یہ تجاویز رکھی گئیں کہ دستور نافذ ہونے کے بعد ایک سال کے اندر اندر صدر ایک کمیشن مقرر کرے گا جو پانچ سال کے بعد اپنی رپورٹ صدر کو دے گا اور پھر مزید چھ ماہ کی تاخیر سے یہ رپورٹ مرکزی اسمبلی میں پیش ہوگی۔

کیا مرکزی اسمبلی کے لیے یہ رپورٹ قبول کرنا لازم ہوگی؟ اس بارے میں دستور ۵۶، پھر خاموش ہے۔ بس صرف اتنی بات ہے کہ اسمبلی اس رپورٹ کی روشنی میں قانون سازی کرے گی۔ اور اگر نہ کرے تو کیا ہو گا؟ کچھ نہ ہو گا۔ قانون سازی کے بارے میں یہ نہیں کہا گیا کہ وہ اسمبلی کے لئے لازم ہو گا کہ وہ رپورٹ کے مطابق قانون سازی کرے، بلکہ صرف یہ کہا گیا ہے کہ اس سلسلے میں قانون سازی کرے گی۔ مطلب ہے کہ جس چیز کو وہ اسلام سمجھے قانون (۱) بنا دے لفظ In respect there of قابلِ غور ہے۔

(۱) آرٹیکل ۹۸ میں ہے۔

The assembly after considering the report shall enact laws in respect thereof.

یہ ان لوگوں نے اس لیے رکھا کہ بیوروکریسی کے مقابلے میں تو انہوں نے اسمبلی اور دستوریہ کو ذلیل کر کے رکھا، مگر اسلام کے مقابلے میں وہ اسمبلی کے اقتدارِ اعلیٰ کو بہر حال مضبوط رکھنے کے داعی رہے۔ کبھی کہا کہ ہم علماءِ بورڈ کو تسلیم نہیں کرتے اس لیے کہ وہ مافوقِ مقننہ (Supra Assembly) بن جائے گا۔ کبھی کہا کہ ایہ کو قانون سازی کا اختیار دیکر اُسے (Supra Legislative body) قرار نہیں دیا جاسکتا۔ غرض یوں ان عناصر نے پاکستان میں ۱۹۵۶ء کے آئین کے ذریعہ ملک میں قوانین کو اسلامیانے کے عمل کو اپنے قابو میں رکھا اور اسکی رفتار کو نہایت ہی سست رکھا۔ (مجھے خوب یاد ہے کہ جب ۱۹۵۶ء کے دستور کے آرٹیکل ۱۹۸ کے تحت کمیشن کے تقرر کا دستوری تقاضا درپیش ہوا تو اس مقرر کو مؤخر کیا گیا صین سال کے اختتام کے آخری دن کمیشن کے مقرر کا اعلان کیا گیا، اس سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ اہتمام پرست حضرات کس قدر بوجھل دل اور سست قدموں کے ساتھ، اس سمت میں چل رہے تھے اور یہ بھی اس لیے کہ جماعتِ اسلامی اور ملک کے دوسرے اسلامی حلقے ان پر مسلسل دباؤ ڈال رہے تھے کہ اسلامی دفعات پر عمل شروع کیا جائے، یہاں تک کہ ایوب خان اور اسکندر مرزا نے مل کر ملک کے اس دستور کو بھی ختم کر دیا اور ایوب خان نے سین سال مطلق العنان حکومت کرنے کے بعد ملک کو اس حیثیت (۱) کا دستور دیا کہ آس کے دسپاچے میں درج قرار مقاصد کو بھی بالکل مسح کر دیا۔ اس کا آغاز ان الفاظ سے کیا کہ »میں محمد ایوب خان فیلڈ مارشل پاکستان کو یہ دستور دے رہا ہوں



(۱) دسپاچے میں یہ بھی لکھتے ہیں:

Now therefore I Field Marshal Muhammad Ayub Khan Hilal-E-Pakistan...

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

دوسو کیس اور ۱۹۶۲ء کا دستور

یہ مقدمہ اس بنا پر بلوچستان کے ایک قیدی نے دائر کیا تھا کہ اسے جس قانون کے تحت سزا دی گئی ہے وہ سرے سے قانون ہی نہیں ہے اس لیے کہ وہ دستور پاکستان ۱۹۵۶ء کے آرٹیکل (۵) کے منافی ہے لہذا کالعدم ہے۔ یہ مقدمہ مفادِ ماضی لاکھوں کے وقت سپریم کورٹ میں زیرِ سماعت تھا۔

اس مقدمہ پر فیصلہ دیتے ہوئے جناب جسٹس منیر صاحب نے ایک کامیاب انقلاب کے قائد کو قانون دہندہ قرار دیا۔ اور یہ کہا کہ ۱۹۵۶ء کا دستور چونکہ منسوخ ہو چکا ہے، اس لیے اب انسانی مساوات کا بنیادی حق ختم ہے اور یہ اہل بے اثر ہو چکی ہے حالانکہ انسانی مساوات اس ذات کی عطا کردہ ہے جس نے حکومت کرنے والے انسان کو بھی پیدا کیا۔ محکوم علیہ انسان کو بھی پیدا کیا اور بیچ صاحبان کو بھی پیدا کیا اور بیمار سے دستور نے بھی اسی ذات کو ملک اور پوری کائنات کا حاکم اعلیٰ قرار دیا ہے۔ قرآن انسانی مساوات کا داعی ہے انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ اور حضور اکرم کا خطبہ حجۃ الوداع اس کا داعی ہے اور باتیاں پاکستان (Founders) نے اور ہماری پہلی دستور نے قرار دو مقاصد کی شکل میں انسانی مساوات کے اصول کو تسلیم کیا تھا (۱) اور ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ انسانی مساوات کے اصول کو تسلیم کریں، مگر منیر صاحب چونکہ بالکل مغربی استعمار کے تربیت یافتہ تھے اور ان کے اصول و قانون کے شیوخ مثلاً ڈائری جیسے لوگ بھی یہ اصول تسلیم کرتے ہیں کہ مقننہ جو کہہ دے وہی حق ہے، مثلاً اگر مقننہ یہ پاس کر دے کہ تمام نیلی آنکھوں والے بچوں کو قتل کر دیا جائے تو یہ قتل کرنا جائز ہو گا۔ اور ایسے بچوں کو زندہ رکھنا بالکل

(۱) قرار دو مقاصد میں ہے۔

“The principles of democracy freedom, equality, tolerance and social justice as enunciated by Islam should be fully observed” (PLD 1973)

تاجائز (۱) ہو جائیگا۔

یہ ان لوگوں کی دنیا ہے جو اس دنیا سے آگے اور کوئی دنیا نہیں مانتے۔ یہ لوگ وضع کردہ قانون کو اصول و قانون کی آخری سرحد قرار دیتے ہیں۔ اگر کوئی پارلیمنٹ طاقتور ہو تو یہ لوگ اسے مقتدر اعلیٰ سمجھتے ہیں اور اگر کسی وقت کوئی فرد پارلیمنٹ کو توڑ کر سامنے آجائے تو ایسے لوگ اُسکے حق میں دلائل جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر ایہ بکواسیلسن قانونی نظام سے بھی اصول بحال لاتے ہیں اور بادشاہ، یا چیف مارشل لائیو منسٹر کو مقتدر اعلیٰ ثابت کرتے ہیں، لیکن اگر یہ لوگ ۱۹۵۸ء کے تسلسل قوانین کے آرڈیننس اور ۱۹۶۲ء کے دستور کو قرار دو مقاصد کی روشنی میں پرکھتے تو آج ہمارے ملک کا نقشہ بالکل مختلف ہوتا۔

جس طرح ۱۹۵۲ء میں مولوی تیز المین کے مقدمے نے غلام محمد کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ کم از کم دستوریہ کا انتخاب کرائے اسی طرح اگر یہ لوگ ایوب خان کے مقابلے میں قانون کی بالادستی قائم رکھتے اور یہ قرار دیتے کہ قرار دو مقاصد ہی وہ اساسی قانون ہے جو دستور سے بھی بالا ہے اور اسے کوئی منسوخ نہیں کر سکتا اور یہ کہ نظریہ ضرورت کے تحت اب ایوب خان کی حکومت صرف اس وقت تک قانونی ہے جب تک وہ انتخابات نہیں کرتے یا ۱۹۵۸ء کا پارلیمنٹ کو بحال نہیں کر دیتے، تو ایوب خان بھی مجبور ہو جاتا اور وہ کوئی جمہوری صورت نکالتا۔

ہائی کورٹ کے ججوں کو کسی مارشل لاء عدالت میں بھی پراسیکیوٹ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ اگر جرأت سے کام لیتے تو ملک کی کاٹری کو پٹری پر ڈال سکتے تھے، لیکن یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ انہوں نے ایسا نہ کیا۔

آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ ایوب خان دور کے اختتام پر عدلیہ نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اس نے طالع آزمائوں کے مقابلے میں قدرے نرم رویہ اختیار کیا ہے

۱۱ (ڈانسی لکھتے ہیں)

"If a legislature decided all blue-eyed babies should be murdered, then the preservation of blue-eyed would be illegal" State Vs Zia-Urrehman PLD 1973 (P. 65)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اور اور یہ کہ یہ التوں کو ان طالع آزمائوں کے مقابلے میں بعض ناقابلِ تنسیخ اساسی قوانین کا سہارا لینا چاہیے تھا اور یہ متغلبین (Usurper) کا مقابلہ بعض اساسی تصورات مملکت سے کرتا چاہئے تھا ۔



۱۹۶۲ء کا دستور اور اسلام

۱۹۶۲ء کے دستور میں اسلام کے ساتھ جو ”حسن سلوک“ کیا گیا تھا وہ صرف یہ تھا کہ اس کے حصہ سونم، اصول قانون سازی میں یہ کہا گیا تھا کہ کوئی قانون اسلام کے خلاف نہ بنایا جائے۔ اور یہ فیصلہ بھی متعلقہ اسمبلی ہی کرے گی کہ کیا چیز اسلام کے خلاف ہے اور کیا خلاف نہیں ہے (۱)، یعنی ایک تو لفظ استعمال کیا (No law should be) یعنی ایسا نہ ہونا چاہیے، لیکن اگر ہو جائے تو اس کا فیصلہ بھی وہی شخص یا وہی ادارہ کرے گا جس نے یہ حرکت کی ہے (۲) اور ظاہر ہے کہ اسمبلی یہی کہنا چاہتی ہے کہ بس وہی اسلام ہے جو اسمبلی پاس کر دے۔

اس دور میں دو افراد حکومت کی حمایت میں سرگرم تھے ایک جناب غلام احمد پرویز جو سربراہ مملکت کو مرکز ملت ثابت کر رہے تھے اور دوسرے ایڈوائزری کونسل اور اسلامی تحقیقاتی ادارے میں مقیم جناب ڈاکٹر فضل الرحمن، جو اسلام کی مرمت ہر وقت کرتے رہتے تھے۔ اور ان حضرات کے مشورے ہی سے قرآن و سنت کے لفظ کو بدل کر اس کی جگہ اسلام کا لفظ لایا گیا تھا۔ اور اپنی تحقیقات میں اسلام کی من مانی تعبیرات کرنے میں یہ دونوں حضرات رات دن مشغول تھے اور انہیں ایوب خان کی پوری سپہرستی حاصل تھی۔

اس دور میں تحریک اسلامی نے ان امور کے علاوہ، اس بات پر سخت احتجاجات کیے کہ ایک تو دستور میں ملک کے نام اسلامک سپیملک سے اسلامک خیال دیا گیا ہے،

“No law should be against Islam”

(۱) الفاظ یہ ہیں:

دستور ۱۹۶۲ء اصول قانون سازی دفعہ نمبر ۱

(۲) کہتے ہیں:

The validity of a law shall not be called in question on the ground that the law disregards, violates or is otherwise not in accordance with the principle of law-making Article 6, Sub(2) 1962 Constitution.

دوسرے قرارداد مقاصد کو جسے بانیانِ پاکستان نے اس ملک کی پوری آبادی کے مطالبے پر پاس کیا تھا اور جو ۱۹۵۶ء کے دستور میں بطور دسپاچ شامل تھی اب اسے بری طرح مسخ کر دیا گیا ہے۔ علاوہ اس اسلامی دفعات کو بھی بے حد کمزور اور ناقص کر دیا گیا (سٹیشن منیر کے فیصلے کے بعد اگرچہ ۱۹۵۶ء کے دستور میں بھی جمہوری روح نہ تھی لیکن ۱۹۶۲ء کے دستور کو تو ۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند کے مقابلے میں بھی ایک گھٹیا دستاویز بنا کر رکھ دیا گیا تھا۔ اس لیے اس میں سرے سے بنیادی حقوق کا باب ہی نہ تھا۔

چنانچہ ایوب خان کے خلاف لہو زبشن جماعتوں نے ایک زبردست تحریک شروع کی جس کے نتیجے میں وداپنے دستور بے نور میں ترمیم کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس جنوری ۱۹۶۳ء کو اس دستور میں پہلی ترمیم کر کے درج ذیل تبدیلیاں لائی گئیں۔

۱۔ باب دوئم میں اصولِ قانون سازی کو بدل کر تمام بنیادی حقوق شامل کر دیئے گئے اور یہ تسلیم کر لیا گیا کہ جو قانون بھی بنیادی حقوق سے متصادم ہو گا، وہ کالعدم تصور ہو گا۔

۲۔ جہاں اسنام کا لفظ استعمال کیا گیا تھا وہاں قرآن اور سنت کا لفظ استعمال کیا گیا۔ یوں اسلامی قوتوں کو ایک گونہ کامیابی حاصل ہوئی۔ غرض تحریکِ جمہوریت کے نتیجے میں اس دستور کا رخ کسی قدر اسلام اور بنیادی حقوق کی طرف موڑ دیا گیا۔

۳۔ از مقاصد کو درست کر دیا گیا اور ریاست کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان کر دیا گیا۔



جسٹس محمد شفیع کا فیصلہ اور منصب رسالت نمبر

جنرل محمد ایوب خان کے عہد حکومت کے دور میں جسٹس محمد شفیع، جج مغربی پاکستان ہائی کورٹ نے، ایک فیصلے^(۱) کے ضمن میں سنت کی آئینی حیثیت سے انکار کر دیا۔ اس فیصلے میں محترم جج نے غلام احمد پرویز ڈاکٹر فضل الرحمن اور صدر ایوب خان کے خیالات سے متاثر ہو کر سنت کو مآخذ قانون تسلیم کرنے سے انکار کر دیا چونکہ ہائی کورٹ کا فیصلہ ماتحت عدالتوں کے لیے ایک نظیر ہوتا ہے اور برادر است اس ہائی کورٹ کی ماتحت عدالتوں کے لیے اسکی پابندی از روئے دستور لازم ہوتی ہے۔ اس لئے مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی طرف فوری توجہ کی۔ آپ نے پہلے کبھی ترجمان القرآن کے خصوصی نمبر شائع نہیں کئے تھے، لیکن اس مسئلے کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر انہوں نے ترجمان القرآن کا ایک خصوصی نمبر ”منصب رسالت نمبر“ کے نام سے شائع کیا۔ اس میں مولانا نے اپنے قلم سے جسٹس شفیع کے فیصلے کا رد تحریر فرمایا اور اس پر دے زیر میں سنت کی آئینی حیثیت کو نہایت ہی مضبوط، مدلل، منطقی اور قانونی اصطلاحات و دلائل سے ثابت کیا۔ یہ کام حضرت مولانا کے بعض عظیم کارناموں میں سے ایک ہے۔ اس نے سنت کی آئینی حیثیت کو ہمیشہ کے لئے غیر مبہم مستند دلائل سے واضح کر دیا اور منکر بن حدیث کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ اس کے نتیجے میں جسٹس محمد شفیع کا فیصلہ دنیائے قانون سے بالکل غائب ہو گیا۔ اور خود ہائی کورٹ لاہور نے اُسے حذف کر

(۱) دیکھئے بی ایس ڈی ۱۹۶۰، رپور صفحات ۱۱۳۲، ۱۱۳۹

(۲) دیکھئے ترجمان القرآن ج ۶۶ شمارہ ”منصب رسالت نمبر“

دیا۔

کسی نے مولانا سے کہا کہ آپ کا یہ تبصرہ تو، توہینِ عدالت کے ضمن میں آتا ہے تو مولانا نے فرمایا کہ میں نے قانونِ توہینِ عدالت کو اچھی طرح پڑھ لیا ہے۔ دنیا کے کسی نظام میں یہ منع نہیں ہے کہ کسی فیصلے پر علمی تنقید کی جائے کیونکہ جج معصوم عن الخطاء نہیں ہوتے۔

مولانا مودودیؒ کی یہ تاریخی تحریر پہلے منصبِ رسالت نمبر کی صورت میں، ۲۷ ہزار کی تعداد میں شائع ہوئی۔ اُس وقت کے لحاظ سے یہ ایک بڑی تعداد تھی۔ بعد میں یہ سنت کی آئینی حیثیت کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اس کے بھی ایک درجن سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ (انہی دنوں خود جسٹس محمد شفیع کا تبصرہ مولانا مودودی کے اس استدراک کے بارے میں شائع ہوا تھا۔ انہوں نے بڑی جرأت سے اپنی فکر و نظر کی اس کمزوری کو تسلیم کیا اور مولانا کے موقف کو درست تسلیم کیا، غالباً مولانا کی اسی تحریر کا نتیجہ تھا کہ مشہور منکر حدیث ڈاکٹر غلام جیلانی برق اپنے عقیدہ اشکار حدیث سے تائب ہوئے اور اپنی ان تمام تحریروں کی منسوخی کا اعلان کیا جو انہوں نے احادیث کے خلاف لکھی تھیں۔ لیکن غلام احمد پرویز آخر دم تک عقیدہ اشکار حدیث پر قائم رہا۔ و امرؤ الی اللہ



www.KitaboSunnat.com

تیسرا باب

یحییٰ خان اور بھٹو کا اقتدار

- فوج اور سیاستدان
- ضیاء الرحمن بنام حکومت
- عاصمہ جیلانی کیس
- ضیاء الرحمن کیس سپریم کورٹ میں



ذوالفقار علی بھٹو

فوج اور سیاستدان

محمد ایوب خان کے خلاف جمہوری تحریک شروع ہوئی اور اس نے زور پکڑا تو بعد از فراہی بسیار، اس نے استعفیٰ دیا یا تازہ دم جرنیلوں نے اس سے زبردستی استعفیٰ لیا، اس لئے کہ وہ خود تو فوج کو استعمال کر کے اقتدار کے مزے لوٹتا تھا، لیکن جب بدنام ہو گیا تو اس نے چپا کہ گول میز کانفرنس منعقد کر کے اقتدار سیاست دانوں کو منتقل کر دے۔ ظاہر ہے کہ اس کے دائیں بائیں بیٹھے دوسرے جرنیلوں کو یہ بات کب منظور تھی۔

بہر حال ایوب خان کے زوال کے نتیجے میں یحییٰ خان آئے۔ انہوں نے غلام محمد اسکندر مرزا اور ایوب خان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سب سے پہلے ۱۹۶۲ء کا دستور ختم کیا اور انتقال اقتدار کے لیے لیگل فریم ورک آرڈر نافذ کیا۔ ملک کے اندر انتخابات ہوئے جس کے نتیجے میں پیپلز پارٹی برسر اقتدار آگئی اور اُس کے بانی ذوالفقار علی بھٹو سربراہ مملکت بن گئے۔

ادھر مشرقی پاکستان میں بحیب الرحمن کی پارٹی عوامی لیگ برسر اقتدار آگئی۔ بھٹو صاحب نے ادھر ہم ادھر تم کا نعرہ لگایا اور سیاست دانوں کی نااہلی کے نتیجے میں ملک دو لخت ہو گیا۔ اس سلسلے میں مشرقی پاکستان کی فوج کشی اور پاکستانی افواج کی شکست تاریخ کا ایک بہت ہی المناک باب ہے۔ بنگلہ دیش عالم وجود میں آگیا اور مارشل لا ایڈمنسٹریشن یحییٰ خان کی جگہ جنرل ذوالفقار علی بھٹو بطور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۲ء میں قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء کے طرز پر ایک عدلیہ دستور نافذ کیا گیا اور پھر ۱۹۷۳ء میں تمام ممبران پارلیمنٹ کے اتفاق سے ۱۹۷۳ء کا دستور نافذ کر دیا گیا جو آج

۱۹۸۸ء تک موجود ہے۔ اس دستور میں پہلے تو خود بھٹو صاحب نے ناروا ترمیم کیں ، لیکن جب پھر مارشل لاء نافذ ہوا تو ان ترمیم کو منسوخ کر کے مارشل احکام نے بے شمار ترمیم کیں جو بعض اسلامی سمت میں ہیں اور بعض ڈکٹیٹر شپ کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ اچھی ترمیم میں ایک تو وہ ترمیم ہے جس کے ذریعہ فیڈرل شریعت کورٹ کا نظام نافذ کیا گیا اور دوسری وہ جس کے ذریعہ قرار داد مقاصد کو دیرپا چے سے نکال کر دستور کا جز بنا دیا گیا۔ باقی تمام ترمیم اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے کی گئیں۔

ضیاء الرحمن بنام سرکار

اس دور میں جو اہم مقدمہ سامنے آیا وہ ضیاء الرحمن بنام سرکار تھا۔ اس مقدمے میں لاہور ہائی کورٹ کے فل منچ نے سب سے پہلے ”تو دو سو کیس“ میں سپریم کورٹ کی اس رائے پر دبے لفظوں میں تنقید کی اور کہا کہ اس وقت سپریم کورٹ میں انقلاب کی کامیابی کا فیصلہ اس لیے دیدیا گیا تھا کہ تمام حالات سپریم کورٹ کے سامنے نہ تھے۔ اور جب سپریم کورٹ نے بزورِ شمشیر کامیاب ہونے والے انقلاب کو جائز قرار دیا تو اس کی وجہ سے وہ انقلاب فی الواقع کامیاب ہو گیا، اگر سپریم کورٹ کے محرم حج حاجان ”دو سو کیس“ میں ایک غائب کے حق میں فیصلہ نہ کرتے تو یقیناً کامیابی کی وہ صورت سامنے نہ آتی جو اس کیس کی وجہ سے ۱۹۵۸ء کے بعد سامنے آئی۔ (۱)

جب ایوب خان جا رہا تھا تو اس نے قوم کے تمام مطالبات تسلیم کر لیے تھے۔ وہ بالغ رائے دہی کی اساس پر انتخابات کا مطالبہ بھی مان چکا تھا اور پارلیمانی نظام حکومت کا مطالبہ بھی اس نے تسلیم کر لیا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے گول میز کانفرنس بلائی،

(۱) جسٹس محمد افضل لکھتے ہیں:

No body can deny the fact that the subsequent success if any, was to a very large extent due to the decision in Dosso's case itself. If the Supreme court had not given the verdict, we are not sure what would have been the consequences. With respect I would refrain from making any further comment on the observations made in that case. PLD 1972 Lahore (P 391)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں اور سیاسی لیڈر جو جمہوریت کا مطالبہ کر رہے تھے اور آج بھی کر رہے ہیں یحییٰ خان جیسے شخص کے دھوکے میں آگئے۔ یحییٰ خان اور بعض دوسرے جرنیلوں اور بعض سیاسی جماعتوں کے گٹھ جوڑ کی وجہ سے یہ خفیہ فیصلہ کیا گیا کہ ایوب خان کے منصوبہ انتقال اقتدار کو سبوتاژ کیا جائے۔

چنانچہ ایوب خان کے خلاف ہونے والی شورش کو خصوصاً گول میز کانفرنس کے بعد کے ایام میں فرو کرنے کے لیے نہ تو سیاسی جماعتوں نے تعاون کیا، نہ سیکور کریسی نے، اور نہ فوج ہی نے۔ یحییٰ خان اور اس کے ساتھی وپر وہ اس سازش میں شریک ہو گئے کہ ایوب خان کو چلتا کیا جائے۔

اس وقت تسبیح دستور کا مطالبہ کسی جانب سے نہ تھا۔ نہ ایوب خان نے یحییٰ خان سے یہ کہا تھا کہ وہ دستور منسوخ کر کے خود قوم کی گردن پر سوار ہو جائے۔ ایوب خان نے یحییٰ خان کو خط لکھا تھا کہ وہ اپنی دستوری ذمہ داریاں پوری کرس۔ اُن دنوں ملک جن حالات سے گزر رہا تھا اُن کے متناظر میں فوج کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ ایوب خان کے ذریعہ یا اُسے ہٹا کر گول میز کانفرنس کے منصوبے پر عمل کرواتی اور اسمبلی کا اجلاس بلا کر اور دستور میں ترامیم کر کے انتخابات کروادیتی (۱) لیکن اس وقت حالت یہ ہو گئی تھی کہ سیاسی لیڈروں کا گول میز کانفرنس تک پہنچنا مشکل بنا دیا گیا اور یہ فریضہ جماعت اسلامی کے کارکنوں کو سرانجام دینا پڑا کہ وہ امن وامان سے لوگوں کو گول میز کانفرنس تک پہنچائیں۔

در اصل اُس وقت فوج مکمل طور غیر جانبدار ہو گئی تھی اور ہونے والے واقعات کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ جس فوج نے ۱۹۵۸ء میں ہونے والے پر امن انتخابات کو ختم کر

(۱) ضیاء الرحمن، نام سرکاری جیشن ظلم فرماتے ہیں

In his letter addressed to Commander-in-Chief he desired of him to fulfil his constitutional responsibility. No body can canvass that the abrogation of constitution was the constitutional responsibility of the Commander-in-Chief. P1 D 1972 Lahore (P. 390)

کے ملک میں فوجی راج قائم کیا۔ اب وہ فوجی جرنیل شہر آشوب کے اس دور میں مکمل طور پر غیر جانبدار ہو گئے۔

بچی خان اس وقت مسٹر بھٹو اور بھاشانی کو درپردہ یہ شہ دے رہا تھا کہ وہ حالات کو خراب سے خراب تر کر دے تاکہ مارشل لا لگانے کا جواز پیدا ہو سکے۔

غرض اس فیصلے میں جسٹس محمد افضل نے واضح طور پر قرار دیا کہ قرار داد مقاصد ایک برتر دستور ہے۔ عدالتوں کا فرض ہے کہ وہ اسے سپر دستور کے طور پر نافذ کریں۔ پاکستان میں کسی ڈکٹیٹر شپ کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اور بچی خان نے دستور ۱۹۷۳ء کو بالکل ناجائز طور پر منسوخ کیا ہے۔ اسے اس بات کا کوئی اختیار نہ تھا۔ اس ملک میں صرف وہی حکومت جائز ہوگی جسے عوام کے منتخب نمائندوں نے قائم کیا ہو نیز عدالتوں کو سرے سے یہ اختیار ہی نہیں ہے کہ وہ اس قسم کی فاصب حکومت کو قانونی جواز فراہم کریں اور جائز تصور کریں۔ لیکن اب پانی سرے سے گزر چکا تھا (۱) جسٹس محمد افضل نے اس فیصلے میں جو ریس اصول وضع کیے ہیں، اگرچہ اس وقت کے سپریم کورٹ کے ججوں نے ان کے ساتھ اتفاق نہیں کیا جس طرح جسٹس کانسٹنٹین اور جسٹس سکار نیلس کے فیصلوں سے اس وقت کے فیڈرل کورٹ نے اتفاق نہ کیا تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے یہ ریمارکس نشانات راہ ثابت ہوئے اور ۱۹۷۳ء کے آئین پر بھی اس کے

(۱) جسٹس محمد غلام کے الفاظ ہیں:

There is no technical bar to treatment of objective resolution as supra constitution. The courts in this country are bound to follow and enforce it.... The State of Pakistan cannot exercise its powers and authority through an individuals or group of individuals in the name of any one person, organ or institution of the state including the armed forces. In other words despotism has been banished from Pakistan once for all and the state power can never be exercised except through choosen representatives of the people. The promulgation of Martial Law and abrogation of constitution by Commander-in-Chief in the name of armed forces and assumption of political power under any garb whatever was against the very basis on which the state was founded. The court have no jurisdiction to accept such usurpation as lawful and valid PLD 1972 Lahore (P. 390)

اثرات مرتب ہوئے اور اسکے بعد ۱۹۷۳ء کے آئین میں ترمیم کر کے ایسے اقدامات کیے گئے کہ اب یہ اصول تسلیم کیے جا رہے ہیں اور اس بات کا امکان پیدا ہو رہا ہے کہ آئینمدہ شاید یہ ممکن بنے۔ ہو کہ کوئی طالع آزمایا مارشل لا کا سہارا لے کر آئے۔

سوال یہ تھا کہ قرار داد مقاصد دستور کا حصہ نہیں ہے، صرف دیباچہ ہے اور یوں وہ قابلِ مذاخہ حصہ (Operative part) نہیں ہے۔ جسٹس ظلمہ محترم اس کا بہت ہی خوبصورت جواب دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ۱۹۷۳ء کا عارضی دستور بھی تو دستور ساز اسمبلی نے بعینہ اسی طرح پاس کیا، یعنی بذریعہ ایک قرار داد جس طرح قرار داد مقاصد بطور قرار داد پاس کی گئی تھی۔ آخر ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ لہذا قرار داد مقاصد کو اگر ایک برتر دستور (Supra Constitution) تصور کیا جائے تو اس میں آخر کیا قانونی یا تکنیکی سقم ہے؟ (۱)



(۱) نکتہ

The interim constitution being debated in National Assembly is also intended to be passed by means of a resolution. Thus there is no technical bar to treatment of objective resolution as supra constitution. P.L.D 1972 Lahore (P 390)

عاصمہ جیلانی کیس

قبل اس کے کہ ضیاء الرحمن کا مقدمہ سپریم کورٹ کے سامنے جائے ، سپریم کورٹ کے سامنے ایک مشہور مقدمہ عاصمہ جیلانی زیر بحث آیا۔ اس مقدمے میں بھی عدالتی اختیارات ، قراردادِ مقاصد اور شفا مارشل لا کے بارے میں بہت ہی اہم فیصلے اور حکمت سامنے آئے ۔ اس لیے ضیاء الرحمن کیس پر مزید بحث سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عاصمہ جیلانی کیس کا جائزہ لیا جائے۔

اس مقدمے میں غور طلب امور درج ذیل تھے۔

(۱) کیا کسی فوجی ڈیکٹیٹر کی جانب سے کامیاب انقلاب اُسے اس بات کا مستحق قرار دیتا ہے کہ وہ دستور کو منسوخ کر دے اور ہر قسم کی قانون سازی کرے چاہے اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو؟

(۲) قانون کی تعریف کیا ہے؟

(۳) ۱۹۶۲ء کا دستور اور ایوب خان کی حکومت کی قانونی حیثیت کیا ہے؟

(۴) یحییٰ خان کا مارشل لا اور اس کے نافذ کردہ دستوری قوانین کی حیثیت کیا ہوگی؟

اس مقدمے میں کامیاب انقلاب کے بارے میں جسٹس منیر کے نظریہ کو بڑی سختی سے رد کیا گیا۔ جسٹس حمود الرحمن نے تفصیل سے بتایا کہ کیلسن کا نظریہ کامیاب انقلاب پہلے تو پوری طرح مسلم نظریہ نہیں ہے۔ کئی لوگ اس کے ساتھ اختلاف بھی کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کے نظریہ کا تعلق بین الاقوامی قانون سے ہے اور بین الاقوامی قانون کا تعلق صرف ریاست کے ساتھ ہوتا ہے۔ کسی ایک ریاست اور اس کے عوام الناس پر اس قانون کا اطلاق غلط ہے (۱) لہذا دوسو کیس میں چیف جسٹس محمد منیر

(۱) حمود الرحمن کہتے ہیں:

The recognition of a state under International Law has nothing to do with internal sovereignty of state. (Asmajilani Vs Government of Punjab) PLD 1972 S.C (P. 140)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کے مشابہات بابت کامیاب انقلاب بالکل غلط ہیں (۱) -

قرار داد مقاصد کے بارے میں جسٹس حمود الرحمن نے کہا کہ کیلسن کے بجائے ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے سیاسی نظریات قرار داد مقاصد سے اخذ کرس کیونکہ یہ قرار داد سورۃ آل عمران کی اس آیت پر مبنی ہے (آیت) ”کہو خدا یا، تو مالک ہے تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے۔“ بھلائی تیرے اختیار میں ہے“ لیکن تعجب یہ ہے کہ یہی جسٹس حمود الرحمن جب فیحاء الرحمن کے مقدمہ میں فیصلہ کرتے ہیں تو قرار داد کو اصل الاصول (Grund Norm) قرار نہیں دیتے البتہ اس مقدمہ میں محترم ججوں نے یہ بہر حال قرار دیا کہ قرار داد مقاصد اور اس کے تحت اسلامی قانون کے مسئلہ مآخذ سے ہمیں اپنے اجتماعی قوانین کی تعبیر میں مدد لینا چاہئے۔

نفاذ مارشل لا کے سلسلے میں ان جج صاحبان نے قرار دیا کہ جرنیلوں کے لیے یہ کوئی اخلاقی یا قانونی جواز نہیں ہے کہ وہ مارشل لا نافذ کرس۔ اس لیے کہ نفاذ مارشل لا سے پورا قانونی نظام تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اگر مارشل لا کا مطلب تمام قوانین اور دستور کی وجہیاں یکجہر نابھ، تو پھر فوج کو یا ریاست اور ملک کی امداد کے بجائے اُسے تباہ کر رہی ہوتی ہے، لہذا یہ جواز پیش نہیں کیا جاسکتا کہ نفاذ مارشل لا کی بھی کوئی ضرورت ہوتی ہے (۲) اس مقدمہ میں بڑی تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ مارشل لا کی کتنی اقسام ہیں۔

مارشل لا ایک تو وہ ہوتا ہے جو کسی ملک کے اندر فسادات کو ختم کرنے کے لئے اس وقت نافذ کیا جاتا ہے جب سول احتظامیہ امن و امان قائم رکھنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔

(۱) لکھتے ہیں

The observation of Chief Justice in Dosso's case are not correct PLD 1972 S.C (P. 241)

(۲) لکھتے ہیں:

Then the armed forces do not assist the state in suppressing disorder but actually create further disorder by disrupting the entire legal order of the state. (Asmaji Khan Vs Government of Punjab) PLD: 1972 S.C (P. 141)

اس وقت فوج انتظامیہ کی امداد کے لئے آتی ہے اور وہ ملک کے عام قانونی نظام کو نہیں چھیڑتی، نہ وہ موجودہ سول برسر اقتدار لوگوں کو ہٹا کر خود مقتدر اعلیٰ بن جاتی ہے، بلکہ سول انتظامیہ کے تعاون میں پورا ملک یا ملک کا کوئی حصہ فوج کے حوالے ہو جاتا ہے۔ مثلاً ۱۹۱۹ء میں امرتسر لاہور اور گوجرانوالہ میں اس قسم کا مارشل لا نافذ کیا گیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں موبہلستان میں، ۱۹۳۰ء میں شعلہ پور میں اور ۱۹۴۲ء میں سندھ کے ان علاقوں میں جہاں خُرقلض تھے۔ نیز ۱۹۵۳ء میں لاہور میں قادیانیوں کے خلاف تحریک کو دبانے کے لئے نافذ کیا گیا تھا۔ یہ مارشل لا سول انتظامیہ کی امداد کے لئے نافذ ہوتا ہے۔

دوسری قسم کا مارشل لا وہ ہوتا ہے جہاں کوئی فوج کسی غیر ملک کو بزور شمشیر فتح کر لیتی ہے وہ وہاں مارشل لا کا نفاذ کر دیتی ہے اس مارشل لا میں فاتح جرنیل کی زبان اور ارادہ قانون کا درجہ رکھتے ہیں۔

تیسرا مارشل لا فوج کے اندر قواعد و ضوابط کے نفاذ کے لئے ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں جو مارشل لا بھی نافذ ہوئے ہیں چاہے ایوب خان کا ہو یا یحییٰ خان کا ہو یا۔ ضیاء الحق کا ہو وہ کسی صورت میں بھی سول انتظامیہ کی امداد کے لئے نہ تھے۔ ان تمام مارشل لاؤں میں سول انتظامیہ کو برطرف کیا گیا۔ ایوب خان نے فیروز خان نون کو یحییٰ خان نے ایوب خان کو اور ضیاء الحق نے مسٹر بھٹو کو اور نہ صرف سربراہان مملکت کو بلکہ دساتیر، بنیادی قوانین اور اسمبلیوں کو برطرف کیا اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مارشل لا خصوصاً یحییٰ کا مارشل لا سول انتظامیہ کی امداد کے لئے تھا۔ بلکہ جن حضرات نے یہ مارشل لا لگوائے انہوں نے محض حصول اقتدار کے لئے لگوائے بقول جناب حمود الرحمنؒ: ”کیا یہ ملک کوئی دشمن ملک تھا جسے ان جرنیلوں نے فتح کیا؟“ (۱) اس لیے یحییٰ خان کا مارشل لا

(۱) جسٹس حمود الرحمن کے الفاظ ہیں:

This country was not foreign country which had been invaded by any foreign army with General Agha Muhammad Yahya Khan at its head nor was it an alien territory which has been occupied by the said army PLD: محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ 1972 S.C. (P. 151)

خلاف قانون تھا اور اس نے جس ضابطے کے تحت سول عدالتوں کے اختیارات ختم کیے تھے وہ بھی خلاف قانون اور بے اثر تھے۔ تمام سول عدالتوں کو یہ اختیار ہے کہ بجٹی خان کے نافذ کردہ قوانین پر غور کرے اور اگر اس میں قانون ضرورت کے تحت کوئی چیز ضروری نہیں قرار پاتی تو اسے کالعدم قرار دے۔“

اب ایک اہم سوال یہ رہ جاتا ہے کہ بجٹی خان کے اقتدار کے اختتام پر اس کی جگہ مسٹر بخشو بطور مارشل لائیٹ منسٹر مڑ آتے ہیں کیا ان کا اقتدار اور اس اقتدار کے نتیجے میں آنے والا دستور اور بعد میں ہونے والے تمام اقدامات بھی کالعدم اور غیر قانونی تصور ہوں گے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ بعض اوقات ایک غاصب، غصب شدہ حقوق اس کے مالکان کو واپس کر دیتا ہے۔ کیا ہمارے لیے یہ کہنا جائز ہو گا کہ چونکہ حقوق دینے والا غاصب ہے اس لیے ہم اس کے ہاتھ سے لپٹا حق نہیں لیتے۔ مثلاً عوام کا یہ بنیادی حق ہے کہ اپنا حکمرانی کا حق اپنے نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے۔ بجٹی خان نے اقتدار پر قبضہ بالکل ناجائز کیا۔ اس کا اقتدار ناجائز اور غیر قانونی تھا۔ اس کے بنائے ہوئے قوانین ناجائز تھے مگر سوال یہ ہے کہ اگر وہ لیگل فریم ورک کے تحت استخبات کرتا ہے، تو کیا وہ بھی کالعدم تصور ہوں گے؟ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ نے اس کا جواب دیا کہ یہ ایک جائز کام تھا، اُسے ایک ناجائز آدمی کی جانب سے ایک جائز فعل تصور کیا جائے گا۔ کسی اچھے کام کو محض اس لیے رد نہ کیا جائے گا کہ وہ ایک ایسے آدمی کی جانب سے ہے جو ولد الحرام ہے یا وہ جس شخص سے صادر ہو رہا ہے، اس کے جسم میں خون رزق حلال سے نہیں پیدا ہو رہا ہے، اس شخص کی کمائی حرام ہے یا اگر وہ حاکم ہے تو اس کی حکومت ناجائز ہے۔ قرآن مجید اس سلسلے میں واضح ہدایت دیتا ہے: تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا

(۱) جسٹس یعقوب علی گیلانی لکھتے ہیں:

The concept of validity is derived from the will of body-politic. If the body-politics gives an express answer that answer is valid and it does not matter who put the question. (Asma Jilani Vs Government of Punjab)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

PLD (1972) S.C. (P. 250)

تعاونوا علی الایم والعدوان (نیکی اور تقویٰ کے کام میں باہم تعاون کرو اور گناہ کاری اور ظلم میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہ کرو) یہی وجہ ہے کہ ضیاء الحق کے مارشل لا کے عرصہ میں جماعت اسلامی پاکستان نے یہ پالیسی اختیار کی کہ اس حکومت کے جائز کاموں کو تسلیم کیا جائے۔ مثلاً اسلامی قوانین کا نفاذ، انتخابات کا انعقاد، افغانستان کے مظلوم مسلمانوں کی امداد اور غیر ذہبی۔ اور ان تمام کاموں کی مخالفت جو اسلام کے خلاف ہوں یا جمہوری اقدار کے خلاف ہوں مثلاً انتخابات میں جماعتوں کو حصہ لینے کی اجازت نہ دینا۔ اقتدار کو طول دینا۔ عریانی اور فحاشی کا رواج، طلباء تنظیموں پر پابندی وغیرہ۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ ۱۹۷۰ء میں انتخابات تو لیگل فریم ورک کے قانون کے تحت ہوئے۔ اور یہ قانون ایسے شخص نے نافذ کیا جسے نہ حکومت کا حق تھا، نہ قانون سازی کا لیکن قومی اسمبلی کا انتخاب اگر کوئی پرائیویٹ انجمن بھی کرا دیتی اور بلا کسی ضابطہ اور قانون کے کرا دیتی اور لوگ ان نمائندوں کو اپنا نمائندہ تسلیم کر لیتے تو بھی وہ جائز نمائندے تصور ہوتے۔ اس لیے کہ نمائندوں کے ذریعہ حکومت کرنا عوام الناس کا اساسی حق ہے اور یہ حق کسی غاصب کے غصب سے ذائل یا ضائع نہیں ہو جاتا۔ بشرطیکہ عوام اسکی منظوری دیدیں۔

اسکی دوسری مثال یہ ہے کہ آج کل (۱) بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ضیاء الحق کی حکومت چونکہ غیر قانونی ہے۔ ہم اُسے تسلیم نہیں کرتے اس لیے اس سے شریعت کے نفاذ کا مطالبہ بھی نہیں کرتے۔ اس لیے کہ غاصب سے اسلامی قانون کے نفاذ کا مطالبہ کیسے کیا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ اسلامی قوانین کا نفاذ پاکستانی عوام کا ایک اساسی حق ہے، اس لیے اس کا مطالبہ ضیاء الحق جیسے ناجائز یا غاصب حکمران سے بھی کیا جاسکتا ہے اور اس کی مثال یوں ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرعون جیسے غاصب اور ناجائز حکمران کے پاس بھیجا کہ وہ بنی اسرائیل کے غصب شدہ حقوق آزادی واپس کر دے اور بنی اسرائیل کو واپس اپنے وطن فلسطین کو جانے کی اجازت دے۔

یہی صورت حال ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات کی ہوگی۔ ان انتخابات میں عوام نے حصہ

لیا اور بھرپور حصہ لیا۔ اسمبلیوں کو عوام نے تسلیم کیا۔ ان اسمبلیوں کے خلاف عوام نے کوئی تحریک نہیں چلائی۔ بلکہ جن جماعتوں نے یہ حکم دیا تھا کہ پولنگ بوتھوں پر پولنگ کی جائے اور الیکشن نہ ہونے دیا جائے عوام نے انہیں مسترد کر دیا اور خود ان جماعتوں کے کارکنوں نے بطور امیدوار اس الیکشن میں شرکت کی۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت اسلامی ان اسمبلیوں کو عوام کا جائز نمائندہ تصور کرتی ہے اور ان سے شریعت کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔ اور دوسری جماعتوں کو بھی یہ دعوت دیتی ہے کہ وہ حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کو تسلیم کر لیں۔

جس طرح بچی خان ایک ناجائز حکمران تھا اور اس ناجائز حکمران کی جانشینی کے طور پر مسٹر بھٹو آنے انکی حکومت کو بھی ناجائز ہونا چاہئے لیکن مسٹر بھٹو کی حکومت کو ہم جائز اس لئے سمجھتے تھے کہ وہ اگرچہ ایک ناجائز حکمران کے ناجائز قانون کے تحت منتخب ہو کر آیا تھا لیکن چونکہ عوام کا نمائندہ تھا، اس لیے اس کی حکومت جائز تھی۔ اسی طرح جماعت اسلامی ایک ناجائز حکمران کے ناجائز قوانین کے تحت منتخب ہونے والی جو نیچو حکومت کو جائز تصور کرتی ہے۔ لیکن یہ بات ان سیاسی ”رُعاء“ کی سمجھ سے باہر ہے جو اس حکومت کے تحت تین سال گزارنے والے اور اس کے خلاف باوجود بیرونی تحریک کاری اور اندرون ملک لسانی اور قوم پرستی کی شورشوں کے قوم کو نہیں اٹھا سکے، لیکن اپنی ضد پر قائم ہیں کہ ہم جو نیچو حکومت کو جائز تسلیم نہیں کر سکتے، حالانکہ یہ لوگ بھٹو حکومت اور جو نیچو حکومت میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں کر سکتے کہ دونوں حکومتیں مارشل لا ایڈمنسٹریٹروں کے مارشل لائی ضابطوں کے تحت وجود میں آئیں۔

عاصمہ بیگم کیس میں ہمارے سپریم کورٹ کے محترم ججوں نے ایسے طالع آزمائوں کے معاملے میں یہ اشارہ دیا کہ دستور میں ایسے لوگوں کے خلاف پیش بندی ہونا چاہئے اور ایسے طالع آزمائو محض فوجی طاقت اور ریور کرہسی کی سازش سے ملک پر قبضہ کر لیتے ہیں اور اپنی طاقت کا مظاہرہ، استغابی معاملات اور قانون سازی کے معاملات میں بھرپور کرتے ہیں اور عدلیہ کے اوروگردائره جیم کرتے ہوئے اسکے اختیار سماعت کے حق کو محدود کر دیتے ہیں ایسے لوگوں کی طاقت کا نشہ جب اتر جائے، ان کی قوت غاصبہ کمزور پڑ

جائے تو ان کے خلاف ملک اور قوم سے بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا جانا چاہئے اور ان کو اس سلسلے میں عبرت ناک سزا دینا چاہئے ، تاکہ آئندہ کسی طالع آزما کو خود اپنی قوم کا خون چوس کر اور قوم کے خزانے سے ستھواہ لیکر قوم کی گردن پر سوار ہونے کی جرأت نہ ہو سکے ۔ صرف ایسی سخت سزا ہی ایسے طالع آزماؤں کو ایسی حرکات سے باز رکھ سکتی ہے (۱) -

چنانچہ سپریم کورٹ کے مشورے سے ۱۹۷۲ء کے آئین میں ایک آرٹیکل نمبر وضع کیا گیا اور یہ تجویز کیا گیا کہ جو شخص آئین کو منسوخ کرے گا وہ ملک کے خلاف بغاوت کے جرم کا مرتکب ہو گا اور اس پر مقدمہ چلا کر سزا دی جائے گی ۔ اب یہ معاملہ مستقبل میں فیصلہ ہو گا کہ ضیاء الحق نے اس جرم کا ارتکب کیا ہے یا نہیں کیونکہ اس نے منسوخ کرنے کے بجائے آئین کو معطل کیا ہے اور معطل کرنے اور منسوخ کرنے میں فرق کرنا عدلیہ کا کام ہے ۔



(۱) جسٹس یعقوب علی خان کے الفاظ ہیں :

My own view is that a person who destroys the national legal order in an illegitimate manner can not be regarded as valid source of law-making. May be that on account of his holding the coercive apparatus of state, the people and the court, are silenced temporarily, but it be laid down firmly that the order which the usurper imposes will remain illegal and courts will not recognize it and act upon them as de jure. As soon as the first opportunity arises when the coercive apparatus falls from the hands of the usurper, he should be tried for the high treason and suitably punished. The doing so will serve as a deterrent to would be adventurers. P.D: 1972 S.C (P. 243)

ضیاء الرحمن کیس سپریم کورٹ میں

جسٹس کائسٹن مین اور جسٹس کارنیلیس کے بعد جناب جسٹس محمد افضل قلدہ حقائق و دلائل کی فوج لیکر پاکستان میں ڈکٹیٹر شپ پر حملہ آور ہوئے اور انہوں نے کافی حد تک جسٹس منیر کے تعمیر کردہ شخصی اقتدار اور اقتدار بالقوہ کے قلعے مسمد کیے۔ سپریم کورٹ کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے جسٹس منیر کو ہدف تنقید بھی بنایا اور اپنے علمی حدود کے مطابق روشنی پیدا کر کے عدلیہ اور قوم کو ایک راستہ دکھایا، لیکن قبل اس کے کہ ان کا یہ مقدمہ سپریم کورٹ میں جائے، سپریم کورٹ آف پاکستان میں جسٹس قلدہ کے دستوری تصورات پر ایک دوسرے مقدمے عاصمہ جیلانی بنام حکومت میں بحث ہوئی اور ڈکٹیٹر شپ کے بارے میں جسٹس قلدہ کے نظریات ڈکٹیٹر شپ کے مقابلے میں پسپائی اختیار کرنے لگے۔

سپریم کورٹ کے ان جج صاحبان کے بیٹش نظر عدلیہ کا اسلامی تصور نہیں تھا، مذکورہ بالا جج صاحبان ہماری عدلیہ کو جس راستے پر ڈالنا چاہتے تھے سپریم کورٹ اس پر جاتی ہوئی نظر نہیں آتی تھی۔ یوں نظر آتا تھا کہ سپریم کورٹ کے جج صاحبان کے ذہنوں میں عدلیہ کا مغربی تصور رچا بسا ہے۔ اس مقدمے میں وہ بار بار یہ اظہار کرتے تھے کہ ایک تحریری دستور جس کے ذریعے ریاست کو حین اہم اعضاء میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اس کے مطابق عدلیہ اس دستور کی پیداوار ہوتی ہے۔ عدلیہ جو کچھ ہے وہ گویا دستور کی تخلیق ہے۔ لہذا وہ دستور کی کسی دھج کو چیلنج نہیں کر سکتی۔ یہ دستور اگر عدلیہ کو ختم کر دے (Abolish) تو یہ ختم ہو جائے گی (۱)۔

(۱) جسٹس محمد الرحمن کے الفاظ ہیں:

It has accepted the position that it is a creation of constitution. PLD: 1973 S.C (P. 71)

جسٹس محمود الرحمن اب یہاں یہ قرار دیتے ہیں کہ قرار داد مقاصد ایک عظیم مقدس دستاویز ہی کیوں نہ ہو اور اُسے اس ملک کی عظیم اکثریت کی حمایت حاصل کیوں نہ ہو، اُسے اس ملک کے بانیوں نے کیوں پاس نہ کیا ہو، وہ بہر حال ہمارے تحریری دستور کا ایک وسیعہ ہی تو ہے اور اس سے ہم صرف یہ کام لے سکتے ہیں کہ اگر دستور کی تعبیر و تشریح میں کسی نوعیت کی الجھن محسوس ہو تو قرار داد مقاصد سے بحیثیت وسیعہ دستور کی فائدہ اٹھایا جائے گا^(۱)

میں نہایت ہی احترام سے یہ عرض کروں گا کہ یہاں سپریم کورٹ نے ان اشارات سے پس پائی اختیار کر لی، جو جسٹس ظہر نے اسی مقدمے میں کہے تھے اور جو خود خاصہ جیلانی کیس میں سپریم کورٹ کے محترم جج صاحبان نے کئے تھے۔

ریاست کا اسلامی تصور بلکہ خود نبوت کا اسلامی تصور ہی یہ ہے کہ اس دنیا میں انصاف قائم کیا جائے قرآن نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے فرمایا: وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ فِيهِ تَحْكُمُ بِهِ وَيُسْأَلُكَ عَنْهُ (اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں) ریاست کا قیام اور حکومت کی اطاعت بھی دنیا میں محض اس لیے فرض کی گئی ہے کہ دنیا میں انصاف کے قیام کے لیے عدالت کنندہ کان کے پاس قوت ہو۔ بادشاہت ہو یا خلافت یا جمہوریت ہو، نظام اجتماعی کے قیام کا اصل مقصد قیام عدالت ہے (اجتماعی نظاموں کے قیام کے مختلف فلسفوں میں سے کوئی فلسفہ بھی یہ تصور نہیں دیتا کہ دنیا میں انصاف کا قیام، عدلیہ کی تخلیق اس لیے کی جاتی ہے کہ نظام حکومت مضبوط ہو، بلکہ تمام تصورات یہی کہتے ہیں کہ حکومت کے قیام کا جواز، یا قانون سازی اور ضابطہ بندی اس لیے کی جاتی ہے کہ عدل کا قیام عمل میں لایا جائے، لہذا اس دنیا میں اصل الاصول یا دستور الدساتیر

(۱) محمود الرحمن:

Therefore, however, solemn or sacrosanct a document, if it is not incorporated in constitution or does not form a part thereof it cannot control the Constitution. (PLD; 1973, S C) (P 74)

(Grund norm) یہ ہے کہ انصاف قائم کیا جائے۔ حکومت اس لیے ہوتی ہے کہ عدالت کو اسکی ضرورت ہے، عدالت اس لیے قائم نہیں ہوتی کہ حکومت کو اسکی ضرورت ہوتی ہے۔

اگر ہم کسی دستاویز کے ذریعے تقسیم کار کرتے ہیں اور عدلیہ، مقننہ اور استظامیہ قائم کرتے ہیں، تو اس سے لازم نہیں آتا کہ عدلیہ مقننہ کی تخلیق کردہ ہوگی۔ اسلامی تصور یہی ہے کہ ہر سوسائٹی کا ایک دستور فوق الدساتیر (Grund Norm) ہو گا۔ اور اس کا علم سوسائٹی میں صرف عدلیہ ہی کو ہو سکتا ہے۔ اگر عرف اور رواج قانون اور دستور ہے تو ج اس کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ عرف اور قانون کیا ہے۔

ہمارے محترم جج صاحبان یہ قرار دیتے ہیں کہ کوئی دستور عدالت کو کالعدم بھی کر سکتا ہے۔ آخر دستور کون بنائے گا۔ کوئی سوسائٹی بنائے گی۔ اور سوسائٹی کیوں قائم ہوئی؟ اس کے قیام کا جواز اور ضرورت کیا ہے؟ قیام انصاف۔ کیا ہم کسی عدالت کے لئے یہ جائز قرار دے سکتے ہیں کہ وہ ظلم کرے؟ تو پھر کس طرح ہم کسی سوسائٹی کے لیے یہ جائز قرار دے سکتے ہیں کہ وہ عدالت کو ختم (Abolish) کر دے! لہذا میں سپریم کورٹ کے ساتھ اس معاملے میں مؤدبانہ طور پر اختلاف کرتا ہوں کہ قرار داد مقاصد اصل الدستور نہیں ہے۔ بلکہ وہ اصل الدستور ہے۔ اصل الایمان ہے۔

دراصل ہر معاشرے کا کوئی نہ کوئی اصل الاصول ہوتا ہے۔ جو معاشرے بادشاہوں کو پوجتے رہے ہیں، اُن کا بھی اصل الاصول یہ رہا ہے کہ بادشاہ جو ارادہ کرے وہ دستور ہے اور اس سے سرتابی کفر ہے۔ آج کل مغربی جمہوریت میں عوام کو یہ درجہ حاصل ہے کہ اصل الاصول ارادۂ عوام (Will of the peoples) ہے۔ اگر مغربی جمہوری تصور کے معیار پر بھی ہم پرکھیں تو بھی پاکستان کا اصل الدستور جمہوری اقدار ہیں۔ اس ملک کے بانیوں اور اس وقت کے عوام نے بہر حال اس کی تشکیل اس لیے نہ کی تھی کہ اس پر غلام محمد، اسکندر مرزا صدر ایوب خان، یحییٰ خان اور ضیاء الحق بذریعہ مارشل لا شخصی حکومتیں قائم کریں، ظاہر ہے کہ بانیان پاکستان اور عوام الناس کا کوئی اصل الاصول تو ہو گا اور وہ اگر مغربی جمہوری تصور ہی مان لیا جائے تو بھی میں اپنی عدالتوں سے پوچھتا ہوں کہ

انہوں نے غلام محمد وغیرہ کو کس اصول کے تحت سند جواز عنایت فرمائی؟ کیا یہ منصفانہ تھی۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ تصور غلط ہے کہ بانیان پاکستان اور اس وقت کے عوام نے محض جمہوریت کی خاطر یہ ملک بنایا۔ ان لوگوں کے پیش نظر اصل الاصول (Grund Norm) تھا اور وہ اسلامی نظریہ حیات تھا اور یہی نظریہ پاکستان ہے جس کا اظہار انہوں نے قرار داد مقاصد کی صورت میں کیا تھا جو آج تک قائم ہے۔

ہمارے بعض جموں نے اس بات کو تو تسلیم کیا ہے کہ قرار داد مقاصد اگرچہ اصل الاصول نہیں ہے، لیکن وہ اصل الاصول کا اظہار ضرور کرتی ہے۔ اور یہ اس بات کا اظہار ہے کہ اس اصل الاصول کو آئینہ دستور میں ثبت کیا جائے گا (۱) لیکن انہوں نے اس قرار داد کو کوئی فوق الدستور دستاویز نہیں مانا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس قرار داد کو دستوریہ نے عوام کے عظیم تر مطالبے کے نتیجے میں دستور کی اساس قرار دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں قرار داد مقاصد کو فوق الدستور ہونا چاہیے!!

درست مؤقف جسٹس ظلمہ بی کا ہے کہ قرار داد مقاصد ایک قابل مفاہد دستاویز ہے اور اصل الاصول ہے۔ اور ہماری عدلیہ کا یہ فرض تھا کہ وہ اس اصول کی روشنی میں اپنے فیصلے دیتی۔ اگر ہمارے دستور کو لازماً، ارادہ عوام اور بانیان پاکستان کے منصوبے کے مطابق قرار داد مقاصد کی اساس پر مرتب ہونا تھا۔ تو یہ قرار داد فوق الدستور قرار پاتی ہے۔

مثلاً اگر کسی قانون کا قرآن و سنت پر مبنی ہونا لازم ہے تو کیا قرآن و سنت اس قانون سے بالا اور سپریم نہ ہوں گے؟ اگر کسی دستور کو ارادہ عوام کا مظہر ہونا چاہئے تو کیا

(۱) مودالرحمن:

"The 'Grund Norm' referred to by the Supreme Court was something even above the objective resolution which embodied the spirit and fundamental norms of the constitutional concept of Pakistan. It was expected by the objective resolution itself to be translated into the constitution, even those who adopted the objective resolution did not envisage that it would be a document above the constitution. (PLD: 1973 S C, P. 73)

عوام یا ادارہ عوام اس دستور سے بالا اصول نہ ہو گا؟ یہ ایک ایسی بات ہے جو بالکل ظاہر و باہر ہے۔
 صحیح بات یہ ہے کہ قرار وادِ مقاصد ہمارے پورے قانونی نظام ہمارے تصورات اور ہمارے معاشی اور معاشرتی تصور کا اصل الاصول ہے اور یہ اصل الاصول اس وقت تبدیل ہو گا جب پاکستان کے پورے باشندے اسلام کے علاوہ کسی اور فلسفہ زندگی پر ایمان لے آئیں۔ پھر ان کا اصل الدستور پچھ اور ہو گا۔



چوتھا باب

جنرل محمد ضیاء الحق کا دور اقتدار

- تحریک نظام مصطفیٰ اور ضیاء الحق کا مارشل لاء
- نصرت بھٹو کیس
- اسلام اور نظریہ ضرورت
- فیڈرل شریعت کورٹ کا نظام
- جسٹس تنزیل الرحمن کے فیصلے



تحریک نظام مصطفیٰ اور ضیاء الحق کامار شل لا

۷ مارچ ۱۹۷۷ء کی شام کو ریڈیو پاکستان سے قومی اسمبلی کے بوگس نتائج نشر ہونا شروع ہوئے، جناب بھٹو کی انتظامیہ نے یہ نتائج پہلے سے مرتب کر رکھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جن حلقوں میں ہینسلز پارٹی کے امیدوار جیت گئے تھے، ان میں نتائج کو نہ چھیدر کیا البتہ جہاں وہ ہار رہے تھے ان حلقوں میں بالکل بوگس اور برعکس نتائج نشر ہونا شروع ہوئے۔ عوام پر سکتہ طاری ہو گیا اور دوسرے ہی دن ہر شخص سراپا احتجاج تھا۔

قومی اتحاد نے احتجاج کی کال دی اور لوگوں نے مظاہرے شروع کر دیے اور ایک ہفتہ کے اندر اندر پاکستان کی تمام بڑی بڑی جیلیں مظاہرین سے بھر گئیں۔ یہ احتجاج اور مظاہرے اس قدر شدید تھے کہ مسٹر بھٹو کی حکومت کا چلنا و شوار ہو گیا، چنانچہ انہوں نے آرڈیکل ۲۳۵ کے تحت بڑے بڑے شہروں کو فوج کے حوالے کر دیا مگر حالات جوں کے توں رہے۔ چیف الیکشن کیشنر نے بھی وسیع پیمانے پر دھاندلی کو تسلیم کیا اور مسٹر بھٹو مجبور ہو گئے کہ قومی اتحاد کے ساتھ بات چیت کریں، چنانچہ جون کے مہینے میں یہ بات بدست ہوئی رہی۔

اس دوران میں جنرل ضیاء الحق کی قیادت میں فوج نے اتحاد پر قبضہ کرنے کے

لیے تیاریاں مکمل کر لیں (۱)۔ خود مسٹر بھٹو کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اب فوج کے رنگ ڈھنگ بدلے ہوئے ہیں، لیکن وہ اس قدر ہمدی آدمی تھے کہ انہوں نے قومی اتحاد کے سامنے ہتھیار ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور مذاکرات کو بالادہ طول دیا۔

اس وقت کے ایڈوکیٹ جنرل یحییٰ بھٹی نے سپریم کورٹ میں مذاکرات کی طوالت کا سبب یہ بتایا کہ قومی اتحاد کا مطالبہ حیدر آباد جیل سے ولی خان اور اُن کے ساتھی قیدیوں کو رہا کرانا اور بلوچستان سے فوج کو واپس بلانا ہے اور یہ بات فوج کے چیف آف سٹاف جنرل ضیاء الحق نہیں مان رہے (۲)، لیکن یہی ضیاء الحق صاحب تھے جنہوں نے بعد

میں اپنے دور حکومت میں ولی خان، ان کے والد اور جی۔ ایم سید جیسے لوگوں کو وہ سہولتیں دیں، جن کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ انہیں خصوصی جہاز فراہم کیے گئے۔ غیر ملکی دوروں کی سہولتیں دی گئیں جہاں انہوں نے اپنے ملک کے خلاف کبھی طور پر اظہار خیال کیا۔

یحییٰ بھٹی کہتے ہیں کہ اس کے باوجود تین جولائی کی صبح کو مسودے پر اتفاق رائے ہو گیا تھا اور اگر ضیاء الحق ۴ اور ۵ جولائی کی رات کو اقتدار پر قبضہ نہ کر لیتے تو بھٹو اور قومی

(۱) یہ تویری رائے ہے البتہ اس سلسلے میں عمارت بعض سیاسی لیڈروں کی رائے یہ ہے: ”یہ حالات کی صحیح تصویر نہیں فوج اور ایف ایس ایف اور پی ایس سی کو عوام پر تشدد کے لئے استعمال کیا جاتا رہا اور اپنی پالیسی کے ورکروں کو بھی اس کے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔ ان میں وسیع پیمانے پر اسلحہ تقسیم کیا گیا یہاں تک کہ یہ بات عوام میں یقین کی حد تک پہنچ گئی کہ جولائی کے شروع میں بلوچستان کا قتل عام ہونے والا ہے۔ لیکن اسے واسے فوج کو نکالیاں دے رہے تھے کہ وہ مداخلت کیوں نہیں کرتی۔ انہوں نے ہاتھ نہ فوج کے ذمہ ڈال رکھا جو اخباروں میں بھی شائع ہوا۔ پھر عام بات ہے کہ ۴ جولائی کی رات کو فوج نہ آئی تو ۵ جولائی کو خون کی ہدیاں بہہ جاتیں۔ اور مارشل لا آئے۔ پورے ملک میں جشن منایا گیا اور گولے پلٹے رہے یہاں تک کہ لوگوں کو اس سے روکنا پڑا مسلم مسجد اور گوردوارے چوک کے خوفی واقعہ۔

اب قارئین خود فیصلہ کریں کہ کون سی بات درست ہے ہاں یہ بات قابلِ طعن ہے کہ ضیاء صاحب نے ۱۱ سال تک محض فسادات روکنے کے لئے حکومت نہیں کی۔

(۲) دیکھئے پی ایل ڈی ۱۹۷۷ء نصرت، بھٹو نامہ چیف آف دی آرمی سٹاف۔ ص ۷۰۲،

”Was delayed by certain actions and attitude of the Chief of the Army
محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اتحاد کے درمیان معاہدے پر دستخط ہو جاتے (۱) اور یہ ملک اس طویل مارشل لاسے بچ سکتا جس میں ۱۹۸۵ء تک رہا۔

جو ٹیم حکومت کی طرف سے مذاکرات کر رہی تھی اُس میں مسٹر بھٹو کے علاوہ مولانا کوثر نیازی اور پیر زادہ شامل تھے قومی اتحاد کی طرف سے مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر عبد الغفور بات کر رہے تھے اور قومی اتحاد کی ٹیم بار بار اس بات کا اظہار کر رہی تھی کہ ہمارے بعض ساتھیوں (اصغر خان) کا فوج کے ساتھ رابطہ ہے۔ کوثر نیازی بھی جلدی معاہدے پر دستخط کے قائل تھے، لیکن پیر زادہ نے آخر دم تک بھٹو کو یہی رائے دی کہ قومی اتحاد ختم ہے، ذرا اور صبر سے کام لیا جائے تو ان کے غبارے سے ہوا نکل جانی گی۔ مسٹر بھٹو اور کوثر نیازی انہی طرح محسوس کر رہے تھے کہ فوج اچھے ارادہ پر قبضہ چاہتی ہے لیکن ایک تو پیر زادہ کی ضد اور دوسرے قومی اتحاد سے نفرت نے انہیں اس بات پر مائل رکھا کہ تاخیری حربے استعمال کئے جائیں۔

فوج مسلسل تیاری میں تھی فوجی قائدین کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بھٹو اب معاہدے پر دستخط کرنے والے ہیں۔ ۴ جولائی کی شام کو کابینہ کا اجلاس ہوا، بد قسمتی سے اس میں ضیاء الحق کو بھی شریک کیا گیا۔ کابینہ میں ہر طرف سے معاہدے پر دستخط کر دینے کے بارے میں دلائل دئے گئے۔ ضیاء الحق نے محسوس کیا کہ اب چڑیا ہاتھ سے جانے والی ہے اس لیے اس رات ہی کو معاملہ صاف کر دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ بات نوٹ کر دینے کے لائق ہے کہ فوج کے اقدام سے چند گھنٹے پہلے مسٹر بھٹو نے جو پریس کانفرنس کی اس میں انہوں نے صاف صاف اعلان کر دیا تھا کہ وہ معاہدہ پر دستخط کر دیں گے (۱) یوں معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اصغر خان کا فوج سے رابطہ تھا، اسی طرح حکومت کے

بعض اور لوگ بھی فوج سے رابطہ رکھے ہوئے تھے مثلاً پیر زادہ۔ آخری وقت جب بھٹو

(۱) جی بی بی سی ۲۷ جولائی ۱۹۷۷ء

In spite of these hurdles created by respondent in fact accord had been reached on morning of 3rd of July 1977 and a formal accord would have been signed if the army had not intervened. (PLD: 1977 S.C 657, P 701)

(۱) دئے مولانا کوثر نیازی کی کتاب "اور لائن کٹ گئی" ص ۱۹۰-۲۰۳
محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

نے دستخط کر دینے کا فیصلہ کیا اور پیر زادہ نے حائل ہونے کی کوشش کی تو بھٹو نے ”سٹاپ“ کہہ کر اُسے خاموش کیا۔ اس سلسلے میں ہمارے بعض نہایت جی محترم اور حالات سے باخبر سیاست دانوں کی رائے یہ ہے: ”اس معاملے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہینرلز پارٹی کے بعض سرکردہ افراد قومی اتحاد اور فوج کے قاعدہ بن کو منظر انداز کر کے اس مسئلے کو اپنے مخصوص انداز میں حل کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے جو یہ تھا کہ جو لوگ حکومت کے مخالف ہیں انہیں ختم کر دیا جائے۔ مبینہ طور پر ان نشان زدہ لوگوں میں جماعت اسلامی کے اکابر اور جماعت کا مرکز منصورہ سر قبرست تھے، گمان کیا جاتا ہے کہ اگر فوج بروقت کارروائی نہ کرتی تو ملک میں بہت خونریزی ہوتی“

لیکن افسوس ہے کہ ضیاء الحق محرم کے گیارہ سالہ دور حکومت نے اب یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ بھی طالع آزمائوں میں سے ایک طالع آزما تھے، ان کے خود اپنے حکومتی نظریات تھے جن پر وہ اصرار سے قوم کو چلاتے رہے۔ وہ محض امن و امان قائم کرنے کے لیے نہ آئے تھے۔ بہر حال معاملہ نیتوں کا ہے۔ چونکہ کسی اصول کی رو سے انہیں گیارہ سال تک قوم کی گردن پر سوار ہونے کا حق حاصل نہ تھا، اس لیے کہ وہ ملازم تھے، اس لیے ہم ان کے اقدام کو بد نیتی پر محمول کرتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

نصرت بھٹو کیس

جنرل ضیاء الحق نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا، یہ جائز تھا یا ناجائز، بہر حال انہوں نے ایسا کرنا مناسب سمجھا۔ اگر وہ قومی اتحاد اور مسٹر بھٹو کے درمیان معاہدے کے انجام کا انتظار کرتے اور دیکھتے کہ اس معاہدے کا انجام کیا ہوتا ہے تو پھر بھی ان کے لیے وہ راستہ کھلا تھا جس پر وہ چلے اور ان پر کوئی الزام بھی نہ ہوتا، یا پھر اگر معاہدے پر دستخط ہو جاتے تو بھی وہ ذرا انتظار کرتے کہ عوام اُسے قبول کرتے ہیں یا نہیں، اگر عوام نہ قبول کرتے اور جس طرح انہوں نے سپریم کورٹ میں تمام خفیہ دستاویزات پیش کیں کہ لوگ خانہ جنگی کے لیے تیار تھے، تو بھی ان کے لیے اقتدار پر قبضے کی راہ کھلی تھی، کیونکہ قوم نے محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

انہیں بددوق خرید کر دی تھی اور وہ ان کے قبضے میں تھی اور اس صورت میں انہیں تاریخ میں لازوال مقام بھی حاصل ہوتا۔ مثلاً ابراہیم لکن جیسا کہ وہ اس صورت میں وہ قوم کو انتشار سے نکالتے۔ مگر افسوس کہ انہوں نے نہایت ہی مشکوک حالت میں اقتدار پر یوں قبضہ کیا جس طرح ایک شکاری شکار کے لیے تاک میں بیٹھا ہو، اور وہ محسوس کرے کہ شکار اڑنے والا ہے۔ یا نظروں سے اوجھل ہونے والا ہے اور وہ جلدی سے فائر کر دے اور وہ گولی نشانہ پہ لگ جائے۔ بہر حال جیسا کہ اوپر دستاویزات سے ثابت کیا گیا مذاکرات کے ایک فریق مسٹر بھٹو کا طرز عمل بھی بہت ہی مشکوک اور نامناسب تھا۔ اس نے حالات کو دیکھتے ہوئے مذاکرات کو طول دیا۔ ممکن ہے کہ بعض فوجی اسے اس پر اکسار رہے ہوں، تاکہ عوام الناس مایوسی کی انتہاؤں تک جا پہنچیں اور فوج کے لیے ایکشن کا جواز ملے۔ اس سلسلے میں خود فوج کا طرز عمل بھی نہایت ہی مشکوک نظر آتا ہے۔ فوج نے بھی۔ جس طرح اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد قومی اتحاد کے مقاصد کی حمایت کی۔ اگر فوج اس اقدام سے پہلے مسٹر بھٹو پر زور دیتی تو وہ قومی اتحاد کے شرائط مان لیتے۔

خود قومی اتحاد کے بعض گوتاہ اندیش لیڈروں نے بھی غلطیاں کیں اور مسٹر بھٹو کی نسبت خطا اور سخت رویہ اختیار کیا جس کا خمیازہ وہ آج تک بھگت رہے ہیں۔ مسٹر بھٹو تو نہ رہے لیکن ان لیڈروں کے اقتدار میں آنے کے تمام امکانات بھی ختم ہو گئے۔ غرض یہ مقدمہ مسٹر بھٹو اور ان کے ساتھیوں کی منظر بندی کے خلاف ان کی اہلیہ سنگم نصرت بھٹو نے پیش کیا اس میں زیر بحث اہم نکتہ یہ تھا

کیا کامیاب انقلاب ایک قانونی فعل تصور ہو گا؟

اس مسئلے میں ضیاء الحق کی جانب سے دو مسٹریز ویٹی اور شریف الدین پیر زاوہ پیش ہوئے۔ مسٹر بروہی (۱) کا مؤقف یہ تھا کہ عہد ۱۹۷۳ء کا دستور بنیادی طور پر قائم ہو

(۱) مسٹر بروہی کے الفاظ ہیں

The grundnorm of old legal order provided by 1973 constitution has given way to a new grundnorm provided by proclamation and law (Constituance In Force Order) (PLD: 1973 S C P 671)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

گیا ہے اور ایک نیا دستوری نظام وجود میں آچکا ہے اور یہ نیا نظام فوق الدستوری (Meta Constitution) اور فوق القانون (Meta.legal) ذرائع سے علاوہ وجود میں آیا ہے اور ہمیں دو سو کیس کی طرح اُسے مکمل طور پر قانونی اور جائز بھی نہیں کہنا چاہئے اور عاصمہ جیلانی کیس کی طرح مکمل طور پر ناجائز اور غیر قانونی بھی نہیں کہنا چاہیے ، البتہ یہ ایک نیا نظام ہے جو اچانک غیر دستوری ذرائع سے وجود میں آچکا ہے اور کامیاب تبدیلی کی وجہ سے عدالتوں کو اُسے قبول کرنا چاہئے

اس کے مقابلے میں پیرزادہ کا موقف یہ تھا کہ موجودہ تبدیلی کو قانون ضرورت کے تحت قبول کرنا چاہئے ۔ اس لیے کہ مسٹر بھٹو اور قومی اتحاد کے درمیان مذاکرات بھی ناکام تھے اور ملک کا امن و امان بھی تباہ تھا اور ملک کے اندر خانہ جنگی کا شدید خطرہ تھا اور ۱۹۷۳ء کے دستور میں اس کا کوئی حل بھی موجود نہ تھا ۔ مسٹر بروہی اور پیرزادہ دونوں نے اتفاق کیا کہ ۱۹۷۷ء میں انتخابات میں دھاندلی کر کے بھٹو کا اقتدار غیر قانونی ہو گیا تھا اور وہ اب غاصب تھا ، اور ضیاء الحق نے یہ اقتدار ایک قانونی مستحق سے نہیں چھینا ، بلکہ ایک غاصب سے چھینا (کیا یہ اقتدار اس نے مقصوب منہ مستحق کی طرف لوٹا دیا؟ اگر نہیں تو پھر ضیاء الحق اس وقت تک غاصب رہے کہ جب تک وہ یہ اقتدار صحیح معنوں میں عوام تک نہیں لوٹاتا ۔ بندر بانٹ کی اس سے اور اچھی مثال کیا ہوگی)

اعجب کی بات یہ ہے کہ عاصمہ جیلانی کیس میں یہ اصول خود جناب بروہی کے دلائل پر وضع ہوا تھا کہ یہ بات ضروری نہیں ہے کہ ہر کامیاب انقلاب قانونی اور جائز بھی ہو اور یہ کہ کیلسن کا نظریہ انقلاب قابض تھا نہیں ہے ۔ لیکن اب نصرت بھٹو کیس میں وہ بالکل

مختلف اور متضاد موقف اختیار کر کے یہ دلائل دیتے ہیں کہ کامیاب اور بالکل غیر دستوری تبدیلی ایک نئے قانونی نظام کو جنم دیتی ہے ۔ نئے اصول اور اصول دستور سامنے آجاتے ہیں اور وہ جائز اور قانونی ہوتے ہیں اور مجوں کو چاہئے کہ وہ انہیں نافذ کریں ۔ بروہی کے لیے یہ مقام نہایت ہی دشوار تھا کہ وہ اس عدالت کو اس بات کا قائل کر لیں کہ کیلسن تیسری جو خود انہی کے دلائل کی وجہ سے عاصمہ جیلانی کیس میں روکی گئی تھی ، اب ایک محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

درست نظر ہے (۱)۔ عدالت نے عاصمہ بیٹلانی کیس کے اصولوں کو باقی رکھا اور مسٹر بروہی کے دلائل کو مسترد کر دیا کہ ضیاء الحق نے ملک کو کوئی نیا لیگل سسٹم دیا ہے۔ بلکہ عدالت نے قرار دیا کہ وہ نظریہ ضرورت کے تحت عارضی طور پر انتخابات کرانے کے لیے آیا ہے اور اسے لہتی پہلی تقریر میں اس بات کو اچھی طرح واضح بھی کیا ہے۔

یہ فالص اور مجرد نظریہ کہ کوئی اچانک تبدیلی اپنے لیے قانونی بواز از خود پیدا کر لیتی ہے پاکستان جیسی قانونی اور نظریاتی ریاست میں تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ملک اس لیے وجود میں لایا گیا تھا کہ اسکے باشندے قرآن و سنت کے مطابق زندگی بسر کر سکیں (۲) اور اسکی کچھ مسلم اخلاقی بنیادیں ہیں اور اس کا ایک نظریاتی پس منظر بھی ہے۔

کیا نظریہ ضرورت کے تحت ضیاء الحق کا مارشل لا جائز تھا؟

نصرت بخت و کیس میں ججوں نے بہر حال یہ تسلیم کیا کہ حالات ناگفتہ بہ تھے، خانہ جنگی

(۱) جسٹس انور الحق لکھتے ہیں:

Mr. Brohi has indeed faced an uphill task before us to question the correctness of the judgement in so far as it rejects the application of kelsen's theory of Law (PLD, 1977 S.C)

(۲) جسٹس انور الحق لکھتے ہیں

It must not be forgotten that the continued validity of the grundnorm has an ethical back ground, in so far as an element of morality is build in it as a part of criterion of its validity.

These considerations assume special importance in an ideological state like Pakistan, which was brought into being as a result of demand of the Muslims of the Indo-Pakistan sub-continent for the establishment of homeland in which they could order their lives in accordance with the -

teaching of Holy Quran and sunnah. When the demand was accepted it was given effect to by means of constitution passed by British Parliament, which held sovereignty over india in 1947. In other words the birth of Pakistan is grounded both in ideology and legality. Accordingly a theory about law which seeks to exclude these considerations cannot be made the binding rule of decision in courts of this country. PLD: 1977 S.C (P 692)

کا خطر تھا۔ ایک عدیل تحریک چل چکی تھی اور دستور علما معطل ہو چکا تھا۔ اس لیے نفاذ مارشل لا کے جواز کے بارے میں فیصد صرف ۱۹۷۳ء کے دستور کی روشنی میں نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ مارشل لا نے اسے دبا دیا ہے۔ اب یہ فیصد صرف قانون ضرورت کے تحت ہی کیا جاسکتا ہے۔ نیز ان وعدوں کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے جو نفاذ مارشل لا کے وقت نئے نظام کے سربراہ نے قوم سے کئے ہیں اور صرف قانون ضرورت ہی اسے جواز ثابت کر سکتا ہے۔

اس فیصلے میں نوڈ چیف جسٹس انوار الحق نے قبرص سپریم کورٹ کے ایک فیصلے پر بحث کرتے ہوئے نظریہ ضرورت میں ضرورت کی حدود کا تعین یوں کیا۔

(۱) یہ کہ غیر معمولی حالات ہوں اور ان میں جو زیر غور اقدام کیا گیا، اسکے دلائل چارہم کردہ ہو۔

(۲) کوئی اور قانونی چارہ جوئی نہ ہو، نہ ہی کوئی دستوری راہ موجود ہو۔

(۳) جو اقدام کیے گئے ہوں وہ عارضی اور عبوری نوعیت کے ہوں (۱)۔

جناب چیف جسٹس نے تسلیم کیا کہ نظریہ ضرورت کے یہ بہترین عناصر ترکیبی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُس وقت جب اس سپریم کورٹ نے ضیاء الحق کے دلائل، تقریروں اور موجود حالات کی روشنی میں درست فیصد کیا لیکن بعد کے حالات نے واضح طور پر یہ بتا دیا کہ ضیاء الحق نے اپنے حدود، اپنے وعدوں سے تجاوز کیا، اور اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے قومی اتحاد، مسٹر بشو اور پوری قوم کو بہت بڑا دھوکہ دیا تو یہ بات بالکل بے جا نہ ہوگی۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ نظریہ ضرورت کا ضرورت کی حد تک محدود ہونا ضروری ہے،

(۱) جسٹس انوار الحق لکھتے ہیں

It seems to me that this summing up of the law of necessity by one of the learned judges of the cyprus Supreme Court embodies the true essence of the doctrine and provides useful practical guidelines for its application.
PLD: 1977 S.C (P 710)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

جناب فیاء الحق اور ان کے ساتھی جرنیلوں نے گزشتہ دس سال میں جو اقدامات کیے وہ حدود ضرورت سے زیادہ ہیں اور ان میں صرف وہی نظریہ ضرورت کے تحت جائز قرار پایا سکتے ہیں جو قرار دادِ مقتصد کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کا اقتدارِ اعلیٰ اور شریعت کے نفاذ اور اسکی برتری کے سلسلے میں کیے گئے ہوں۔ یہ وہ اقدامات جو عوام الناس کی بھلائی کے لیے ہوں اور جن کی وجہ سے ملک میں جمہوری اقدار فروغ پائی ہوں (نظریہ ضرورت پر اسلامی نقطہ نظر سے مفصل بحث ہم دوسری جگہ کر چکے ہیں اسید ہے کہ قارئین اُسے بھی ہمیشہ منظر رکھیں گے) مثلاً حدود و کانتظام فیئہ دل شریعت کورٹ کے نظام کا قیام، اسلامی قانون شہادت کا نفاذ، اسلامی نظام عشر و زکوۃ کا شفاف و واقدمات ہیں جو قرار دادِ مقتصد کے سمت میں ہیں۔ ۱۹۸۵ء کے انتخابات اور ان کے نتیجے میں اسمبلیوں اور سینٹ کا قیام وغیرہ کے سلسلے میں جو اقدامات کیے گئے ہیں وہ جمہوری اقدار کی طرف ہمیشہ قدمی کے ضمن میں آتے ہیں اور نظریہ ضرورت کے تحت جائز قرار پاتے ہیں۔



منظریہ ضرورت اور اسلام

(چونکہ نصرت بھٹو کیس کا فیصلہ منظریہ ضرورت کے تحت ہوا تھا اس لیے یہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ اسلام میں منظریہ ضرورت کی مختصر وضاحت کر دی جائے) اس وقت دنیا کے قانونی نظام میں منظریہ ضرورت بطور ایک اہم اصول کے تسلیم کیا گیا ہے اور اس کی اساس پر بہت اہم قانونی اور دستوری فیصلے کیے گئے ہیں۔ یہاں مناسب ہو گا کہ اسلامی نقطہ نظر سے منظریہ ضرورت کی کسی قدر تشریح کر دی جائے کیونکہ اسلام میں یہ ایک مسلمہ دستوری اور قانونی اصول ہے۔

اسلامی نظام زندگی ایک فطری نظام زندگی ہے۔ خود قرآن مجید میں یہ کہا گیا ہے: **فطرت اللہ الّٰہی فطر الناس علیہا** ”اللہ کی فطرت جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا“ اور یہ فطرت (۱) ایسی ہے کہ انسان ہمیشہ ایک حالت میں نہیں ہوتا۔ بعض اوقات حالات غیر معمولی ہوتے ہیں اور وہ اس قدر غیر معمولی ہو جاتے ہیں کہ ان کو اپنی اصل حالت کی طرف لوٹنا انسان کے بس میں نہیں رہتا۔ یہاں اگر پھر انسان کی راہنمائی اسلامی نظام زندگی کا ایک دوسرا اصول کرتا ہے وہ ہے **لا یكلف اللہ نفسا الا وسعہا** ”اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اسی قدر تکلیف دیتا ہے جس قدر اس کی وسعت ہو“ ایسے حالات میں بعض ایسے ضوابط عارضی طور پر معطل ہو جاتے ہیں جو معمولی حالات میں لازمی ہوتے ہیں اور اس وقت تک معطل رہتے ہیں جب تک عام حالات معمول پر نہیں آ جاتے۔ جو نہی حالات معمول پر آجائیں اسلامی نظام زندگی کے اصولی ضابطے پھر لوٹ آتے ہیں۔

جن آیات اور احادیث اور اقوال فقہاء سے یہ نظریہ اخذ کیا گیا ہے، مناسب ہے کہ یہاں ان کا ذکر تفصیل سے کر دیا جائے۔

۱۔ فطرت کی جگہ یہاں عادت پڑھنا چاہئے جو پختہ ہو کر فطرت مانی کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ فطرت کے بارے میں تو یہ بات مسلمہ ہے کہ حالت کی اجتہادی نماز کا رمی بھی اسے بھول نہیں سکتی۔ (لوارد)

سب سے پہلے سورۃ بقرہ کی آیت ۱۷۲ ہے۔ (آیت) ”اللہ کی طرف سے اگر کوئی پابندی تم پر ہے تو وہ یہ ہے کہ مردار نہ کھاؤ، خون سے اور سور کے گوشت سے پرہیز کرو اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے سوا کسی کا نام لیا گیا ہو۔ ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھالے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز نہ کرے تو اس پر گناہ نہیں ہے۔ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے“ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ اسکی تشریح میں فرماتے ہیں: ”اس آیت میں حرام چیز کے استعمال کرنے کی اجازت تین شرطوں کے ساتھ دی گئی ہے۔ ایک یہ کہ واقعی مجبوری کی حالت ہو۔۔ دوسرے یہ کہ خدا کے قانون کو توڑنے کی خواہش دل میں موجود نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ ضرورت کی حد سے تجاوز نہ کیا جائے“ (۱)

اسی مضمون کی طرف اشارہ: المائدہ آیت ۴ ”البتہ جو شخص بھوک سے مجبور ہو کر ان میں سے کوئی چیز کھالے۔ بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف اس کا سیدھا ہو“ (المائدہ آیت ۴)

ورد اللہ کی آیت: (ترجمہ) حالانکہ جن چیزوں کا حالت اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں کھانا حرام ہے اس کی تفصیل وہ تمہیں بتا چکا ہے“ (الانعام آیت ۱۱۹ اس آیت میں اشارہ ان تفصیلات کی طرف ہے جو النحل۔ آیت ۱۱۵ میں بتائی گئی تھیں) (آیت) ”اللہ نے جو کچھ تم پر حرام کیا ہے وہ ہے مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جن پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ البتہ بھوک سے مجبور ہو کر اگر کوئی ان چیزوں کو کھالے، بغیر اس کے کہ وہ قانون الہی کی خلاف ورزی کا خواہش مند ہو یا حد ضرورت سے تجاوز کا مرتکب ہو“ (النحل: ۱۱۵)

اُذرو نے قرآن منظرِ ضرورت بہر حال نہایت ہی مشکل حالات کے لیے ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص کا معاملہ ہے اور اس شخص کی زندگی خطرے میں ہو اور اگر ملک و قوم کا مسئلہ ہو تو اس میں پورے ملک اور قوم کے لیے خطرہ ہو اور یقینی اور واقعی خطرہ

موجود ہو، محض فریب کاری یا طالع آزمائی کا کھیل نہ ہو۔

جن ججوں نے ضیاء الحق یا یحییٰ خان کو نظریہ ضرورت کے تحت اختیارات دیے ان کا فرض تھا کہ وہ مابعد کے ادوار میں اس پر نظر رکھتے کہ آیا جناب صدر نسیب، الحق دائرہ ضرورت کے اندر ہیں یا اس سے باہر نکل گئے ہیں! اگر کسی شخص کو انفرادی طور پر بھی ایسے حالات سے سابقہ درپیش ہے، تو اُس کا ایمان اور ضمیر اس کے لیے جج ہیں۔ اس کے لیے حکم یہ ہے کہ فاستغث قلبک (تم اپنے دل سے استفتاء کرو) اگر ضرورت کے اندر حکم عدولی ہوتی ہے تو معاف تصور ہو گا۔

اوپر جن آیات کا ذکر ہوا ہے ان میں اگر اہ اور اضطراب کے الفاظ استعمال ہونے ہیں اور جو لوگ غریب جاتے ہیں۔ وہ ضرورت اور اضطراب کا فرق بھی جانتے ہیں۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ یہاں اضطراب کے لیے آیت میں دو شرائط عاید کی گئی ہیں، ایک یہ کہ اس قانون سے استفادہ کرنے والا شخص باغی نہ ہو، باغی کے دو معنی تفاسیر میں بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ شخص کسی قانونی حکومت کا باغی نہ ہو، اس معنی کی رو سے قون کے ذریعہ انقلاب لانے والے سرے سے اسلامی نظریہ ضرورت سے استفادہ ہی نہیں کر سکتے، اگرچہ حنفیہ نے اس مفہوم سے اختلاف کیا ہے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ شخص فی الواقع مجبور ہو قانون شکنی مقصود نہ ہو۔ دوسری شرط غیر عادی ہے۔ یعنی وہ حد ضرورت سے تجاوز نہ کرے۔

قرآن کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سنت کے ان نصوص کو بھی یہاں مختصراً بیان کر دیا جائے جن سے فقہاء نے نظریہ ضرورت کو اخذ کیا ہے یا جن سے ہمارے محرم سپریم کورٹ نے نظریہ ضرورت کے اخذ کا استدلال کیا ہے۔

ایک حدیث حضرت عباد بن شریب عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قحط کے سال میں وہ ہرن نہ آئے، کسی کے باغ میں گئے اور کھجوروں کا ایک خوشہ توڑا۔ کھایا بھلی اور کپڑے میں باندھ بھی لیا۔ باغ کے مالک آ پہنچے۔ انہوں نے مجھے مارا۔ اور میرا کپڑا بھی مجھ سے لے لیا۔ میں حضورؐ کے پاس آیا اور فریاد کی۔ آپ نے اس شخص سے کہا: ”کہ اگر وہ بھوکا تھا تو تمہارا فرض تھا کہ اُسے کھانے کو دیتے اور اگر جاہل تھا تو اُسے تعلیم

دیتے "اس کے بعد حضورؐ نے اُسے بیت المال سے نصف دسق یا پورا دسق خوراک دی ۔
(ابن ماجہ)

ایک دوسری حدیث میں حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ حضورؐ سے روایت بیان کرتے ہیںکہ آپؐ نے فرمایا "تم میں سے کوئی اگر کچھ مویشیوں تک پہنچے، تو اگر مالک موجود ہو تو اس سے اجازت لے ۔ اگر وہ اجازت دے تو پھر وہ مویشی سے دودھ نکال کر اُسے پی لے ۔ اگر مویشیوں کا مالک موجود نہ ہو تو تین بار آواز بلند سے پکارے ۔ اگر کوئی جواب دے تو اس سے اجازت لے ۔ اگر وہ اجازت دے تو دودھ نکال کر پی لے ۔ اگر کوئی جواب نہ ملے تو دودھ نکلے اور پی لے، لیکن ساتھ نہ لے جائے (ابوداؤد)

ایک اور حدیث میں ابن عمر رضی اللہ عنہ حضورؐ سے نقل فرماتے ہیں "جو کسی باغ میں داخل ہو تو کھالے، مگر ساتھ کچھ نہ لے" (ترمذی)

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ سے لکھتے ہوئے کھجوروں کے کچھوں کے بارے میں پوچھا گیا آپؐ نے فرمایا "اگر کسی ضرورت مند کو ملیں وہ کھالے لیکن ذخیرہ کر کے ساتھ نہ لے جائے تو اس پر کوئی مواخذہ نہ ہو گا"

ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے تصریح کی ہے کہ ان احادیث کا اطلاق اس شخص پر ہو گا جو مجبور و مضطر ہو ۔ غرض وہ تمام احادیث جن سے ضرورت کے وقت ایک عام اصول قانون میں استثنائی صورت پیدا کی جاتی ہے ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی طالع آزمائے کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس رخصت کو چند ہفتوں اور مہینوں کے بجائے اسے دس بارہ برسوں تک طول دیدے ۔ کسی کے باغ میں جا کر مستقلاً خیمہ لگا دے اور جب صبح و شام اُسے بھوک لگے تو یہ کہ کرباغ کو سخت و تاراج کرتا رہے کہ میں مجبور ہوں یا اس باغ کو میری ضرورت ہے ۔

فقہاء نے نظریہ ضرورت کے کئی اصول و قواعد وضع کیے ہیں ۔ اگر ایک طرف یہ قاعدہ وضع کیا ہے: الضرورات تصحیح المحظورات (۱) (ضرورت کے وقت ممنوعہ کاموں کی

اجازت دی جاتی ہے) تو اسکے ساتھ ہی یہ قاعدہ بھی تجویز کیا ہے: ملائج للضرورة۔ یہ تصور بقدرہا (جو کام ضرورت کے تحت جائز کیا گیا ہو) اسکی اجازت اسی قدر ہوگی جس قدر ضرورت کا تقاضا ہو (۱) جو نہی ضرورت ختم ہوگی، اجازت بھی ختم ہو جائے گی مجاز لغذر بطل بزوالہ (جس کام کی اجازت کسی عذر کی وجہ سے دی گئی ہو، عذر جاتے ہی اجازت ختم تصور ہوگی) (۲)

اسلام نے نظریہ ضرورت کے تحت جو اصول دیئے ہیں ہمارے فقہاء نے انکو بڑی تفصیل سے منضبط کیا ہے۔ کتب فقہ میں تمام تفصیلات موجود ہیں۔

ان تمام مباحث کے بعد جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نصرت بھٹو کیس میں ہمارے مجوں نے ضیاء الحق کو نظریہ ضرورت کے تحت جو اختیارات دئے وہ بالکل عارضی تھے، ایک محدود وقت کے لیے تھے، اور نہایت ہی عارضی اسباب کی وجہ سے تھے۔ اس لیے ہمارے مجوں کو چاہئے تھا کہ اس مقدمہ میں اپنے فیصلے کے اندر ان اصولوں کے پیش نظر جنرل ضیاء الحق پر پابندیاں عاید کر دیتے اور یہ صاف صاف لکھ دیتے کہ اگر وہ ۹۰ دن کے اندر اندر انتخابات نہ کرائیں گے تو انکی حکومت اخلاقاً اور قانوناً ختم تصور ہوگی چاہے علما باقی

ہو۔ مستقبل کے مؤرخ کو اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آنے کی کہ ضیاء الحق نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا۔ اور ہمارے سپریم کورٹ نے اسے جو اختیارات دئے تھے، اس سے انہوں نے بالکل ناجائز فائدہ اٹھایا۔ ہمارے مجوں کے لیے مناسب یہی تھا کہ وہ کیلسن (kalson) کے نظریہ کا مہیب انقلاب کے تحت ہی ضیاء الحق کو کلی اختیارات دیدیتے۔ کیلسن کے نظریہ کا عام فہم خلاصہ یہ ہے کہ ”جس کی لائٹھی اسکی بھینس“۔ چونکہ بیسویں صدی میں قانون کے یہ جنگلی اصول اپنے نہیں لگتے تھے، اس لیے ہمارے مجوں نے ان اصولوں کے بجائے اسلام کے نظریہ ضرورت کا

سہارا لیا ، لیکن ان کے لیے مناسب یہ تھا کہ وہ قرآن و سنت اور فقہاء اسلام کے مظاہر کے مطابق نظریہ ضرورت کا صحیح اطلاق کرتے اور فیصلے کے اندر ایک ایسا معیار وضع کر دیتے جس کی پابندی ضیاء الحق کو کرنی ہوتی یا پھر وہ ایک عبوری فیصلہ دیدیتے اور مقدمے کے ریکارڈ کو داخل دفتر کر دیتے اور یہ ریکارڈ ریکارڈ کر دیے جاتے کہ کوئی فریق بھی کسی وقت اس مقدمے کو مزید کارروائی کے لیے سرسبز کر سکتا ہے ۔ یہ کام ہمارے سپریم کورٹ کے محترم ججوں کے لیے کوئی مشکل بھی نہ تھا ۔ کیونکہ ضیاء الحق جب وقتی طور پر نصرت بھٹو کیس کے فیصلے سے فائدہ اٹھا کر آگے بڑھے، تو انہوں نے اپنے آپ کو مطلق العنان ثابت کرنے کے لیے ایک نیا دستور نافذ کیا ۔ جس کے تحت سپریم کورٹ کے کئی ججوں نے حلف اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اگر یہ محترم جج صاحبان نصرت بھٹو کیس میں بھی ذرا سخت موقف اختیار کرتے تو انہیں ایسی صورت حالات سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔



فیڈرل شریعت کورٹ کا نظام

(مرحوم ضیاء الحق نے اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے جو اقدامات کئے ان میں سے ایک فیڈرل شریعت کورٹ کا نظام ہے۔ مناسب ہے کہ یہاں اس کا خلاصہ درج کر دیا جائے)

بھل ضیاء الحق نے جو اہم، ضروری اور قابل قبول کام کیے، ان میں سے ایک فیڈرل شریعت کورٹ کا نظام بھی ہے، یہ نظام سب سے پہلے ایک صدارتی حکم نمبر ۲۲ بحریہ ۱۹۷۸ء کے ذریعہ قائم کیا گیا۔ جہائی کورٹ میں ایک شریعت بینچ قائم کیا گیا، جسے یہ اختیارات دیے گئے کہ وہ مستثنیٰ شدہ قوانین کے علاوہ تمام دوسرے قوانین پر غور کر کے ان کے بارے میں یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ قانون یا اسکی فلاں دفعہ اس حد تک شریعت کے خلاف ہے اور صوبائی حکومت یا مرکزی حکومت کو چاہئے کہ وہ اتنے دنوں کے اندر اس میں فلاں فلاں ترمیم کر کے اسے شریعت کے مطابق بناوے۔ اگر متعلقہ حکومت مقررہ میعاد کے اندر ترمیم نہ کرے تو اس تاریخ سے وہ قانون ترمیم شدہ شکل میں نافذ تصور ہوگا۔

اس حکم میں دو کمزوریاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ یہ صدارتی حکم تھا اور کوئی دوسرا صدر اسے کسی بھی وقت منسوخ کر سکتا تھا، دوسرے یہ کہ ایک ہی نکتہ پر مختلف بانی کورٹوں کے شرعی بینچوں کی جانب سے مختلف قسم کے فیصلے آ سکتے تھے۔ اس لیے ان دونوں کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے صدر نے دستور کا ترمیمی آرڈر نمبر ۱۹۸۱ء جاری کیا۔ اس دستوری ترمیم کے ذریعے دستور پاکستان کی دفعہ (۲۰۳-اے) سے لیکر آرٹیکل (۲۰۳-آئی) تک کا اضافہ کیا اس ترمیم کے ذریعے ایک تو صوبائی شریعت کورٹ بینچز کی جگہ فیڈرل شریعت کورٹ کا نظام نافذ کیا گیا اور دوسرے یہ کہ اس نظام کو دستوری تحفظ دیا گیا نیز شریعت کورٹ کو دستوری تحفظ دینے کے ساتھ ساتھ اسکی حدود کار کو بھی تحفظ دیا گیا، اسکے بعد جب اسلامی حدود کا نفاذ کیا گیا تو سیشن کورٹ کے فیصلے کے خلاف ایپیل کا

حق بھی فیڈرل شریعت کورٹ کو دے دیا گیا، اس طرح حدود کے مقدمات میں فیڈرل شریعت کو عدالت لہجیل کا درجہ دیکر اس کے نظام کو زیادہ مستحکم اور مؤثر بنا دیا گیا۔

فیڈرل شریعت کورٹ کو بعد میں یہ اختیارات بھی سونپ دئے گئے کہ وہ از خود بھی پاکستان میں نافذ قوانین پر غور کر کے یہ فیصلہ دے سکتی ہے کہ فلاں فلاں قانون شریعت کے خلاف ہے اس سلسلے میں بے شمار قوانین پر غور کیا گیا اور بہت سے فیصلے کیے گئے۔

ایک اہم فیصلہ جو اس سلسلے میں ہوا وہ قانون شفعہ کے بارے میں سپریم شریعت کورٹ کا فیصلہ تھا جو ۳۱ جولائی ۱۹۸۶ء کے بعد نافذ ہو گیا۔ اس میں قانون شفعہ صوبہ سرحد ۱۹۵۰ء اور قانون شفعہ پنجاب مجریہ ۱۹۱۳ء میں بے شمار ترمیمات کی گئیں جن پر آج تک تمام عدالتیں عمل پیرا ہیں، اس نظام کے ذریعے اسلامی شریعت کے نفاذ کی طرف کافی پیش قدمی ہوئی، لیکن ۱۹۸۵ء کے انتخابات سے قبل صوبائی اور مرکزی حکومت نے مرکزی مشاورتی کونسل کی ہدایات کے باوجود اس سلسلے میں قانون سازی میں غفلت برتی اور ۱۹۸۵ء کے انتخابات کے بعد بھی مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں نے مشاورتی کونسل اور فیڈرل شریعت کورٹ کی ہدایات کے مطابق بہت ہی کم قانون سازی کی۔ صرف حکومت صوبہ سرحد نے اپریل ۱۹۸۷ء میں ایک قانون شفعہ نافذ کیا جو اسلامی لحاظ سے مزید نقائص کا حامل ہے۔ اور اس کے خلاف دوبارہ فیڈرل شریعت کورٹ میں جانا پڑے گا۔ اس میں بعض دفعات ایسی وضع کروئی گئی ہیں جو سراسر دستور پاکستان کے بھی خلاف ہیں اور بعض ایسی ہیں کہ جن کی کوئی اصل شریعت میں نہیں ہے۔

مثال کے طور پر اسکی دفعہ ۳۵ دستور پاکستان کے آرٹیکل نمبر ۲۶۴ کے خلاف ہے۔ اس آرٹیکل میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ اگر کوئی قانون منسوخ ہو جائے تو سابقہ حقوق و فرائض کا آئین سابقہ قوانین کے مطابق ہی کیا جائے گا۔ مثلاً مارشل لار گولیشن ۱۱۵ کے تحت مضارعین کو حقوق شفعہ حاصل ہوتے اور ۳۱ جولائی ۱۹۸۶ء کے بعد یہ حق منسوخ ہو گیا تو سابقہ مقدمات سابقہ قوانین کے مطابق ہی فیصلہ ہوں گے۔

غیر دوی مقام بھی ایک خاص کام تھا لیکن یہ بھی نقائص سے پاک نہیں تھا یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ جب نبیؐ کے دور میں سود کی حرمت کا حکم نافذ کیا گیا تو لوگوں کو

یہ حق دیا گیا کہ وہ اپنا اصل زر وصول کر لیں۔ حالانکہ ان میں سے بعض لوگوں نے اصل زر سے زیادہ سود وصول کر لیا تھا صرف یہ حکم دیا گیا کہ جن لوگوں کی رقمات سود بقیہ ہیں وہ انہیں وصول نہیں کر سکتے۔ اگر یہ حکم دیا جاتا کہ سود خواروں کے حسابات کیے جائیں گے اور اگر انہوں نے اصل زر کے مطابق رقم وصول کر لی ہوگی تو انہیں اصل زر بھی نہ ملے گا اور اگر زیادہ رقم بحسب سود حاصل کی ہوئی ہے تو وہ زیادہ رقم واپس لی جائے گی تو بہت سی الجھنیں پیدا ہوتیں، چنانچہ قابل عمل اور الجھنوں سے پاک حکم دیا گیا۔

فرماتے ہیں: (آیت) ”جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آجائے اور وہ باز آجائے، تو جو گزر گیا اس کے لیے ہے“ (۲۷:۴) یعنی جو سود کھا چکا اس سے واپس لینے کا قانوناً مطالبہ نہیں کیا جائے گا اور آیت میں ارشاد ہوا (آیت) ”اگر توبہ کر لو تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے حقدار ہو گے“ (۲۷:۴)

خلاصہ کلام یہ کہ شریعت اسلامی نے اس اصول کو تسلیم کیا ہے کہ سابقہ قوانین کے مطابق ہی فیصلے ہوں گے۔ یہ نہ ہو گا کہ شریعت کو مؤثر باضی قرار دیکر سابقہ حقوق میں رد و بدل کر دیا جائے۔ اگرچہ سابقہ حقوق شریعت کے مطابق نہ ہوں۔

یہ درست ہے کہ فیڈرل شریعت کورٹ کے ذریعہ تحقیق و تفتیش کے بعد کسی قانون کے بارے میں فیصلہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے خلاف ہے یا نہیں؟ اور اگر یہ عدالت کسی قانون کو اسلام کے خلاف قرار دیدے تو اس کے بعد متعلقہ مقننہ کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ فوراً اس میدان میں اسلام کے مطابق قانون سازی کر دے۔ لیکن علما جو لوگ صدر اور گورنر کے عہدوں پر ہیں یا جو لوگ صوبائی اور مرکزی مجالس قانون کے ممبر ہیں، ان کو اسلامی قانون کے ساتھ ایسی دلچسپی نہیں ہے جو پاکستانی عوام کو ہے یا دیوبندی اعلیٰ عدالتوں کو ہے۔ اس لیے عموماً ایسا ہوتا ہے کہ اس میدان میں قانون سازی نہیں کی جاتی۔

ایک مشکل یہ بھی ہے کہ جو لوگ مقننہ کے ممبر ہیں چاہے وہ وزیر کے عہدے تک پہنچ گئے ہوں وہ عموماً نااہل ہوتے ہیں۔ ان لوگوں میں دو کمزوریاں جمع ہیں۔ ایک یہ کہ ان کو اسلام کے ساتھ دلچسپی نہیں۔ ان کا مزاج سیکولر اور ادا یورپیئن ہے، دوسرے یہ محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کہ بالعموم یہ لوگ نااہل ہوتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اسلامی حوالے سے نااہل ہوتے ہیں، بلکہ روزمرہ کے امور میں بھی سکریٹریوں کے تابع مہمل ہوتے ہیں، اس لیے علاوہ یہ کچھ ہوتا ہے جس میں یہ کاتب (Secretary) و چپسی رکھتے ہوں یا جس کے بارے میں اوپر سے خصوصی دباؤ ہو۔

یہ عیوب اس لیے پیدا ہو گئے ہیں کہ دنیا کے ہر منصب کے لیے کچھ نہ کچھ قابلیت ضروری ہوتی ہے، مگر عوامی نمائندگی ہی ایک ایسا شعبہ ہے جس میں ہر جاہل اسمبلیوں کا ممبر بن سکتا ہے، چاہے اس میں قابلیت ہو یا نہ ہو۔ اس بارے میں بارہا سوچ بچار کرنے کے باوجود ہماری قیادت نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔

اس صورت حال کے باعث عدالتوں میں یہ مشکلات پیش آتی ہیں کہ وہ شریعت کورٹ کے ضابطوں کی روشنی میں فیصلے نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ اکثر عدالتیں دفعات کی شکل میں وضع شدہ قانون ہی سے استفادہ کر سکتی ہیں۔ اصول قانون کی روشنی میں کوئی فیصلہ کرنا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے، لہذا اس بات کی ضرورت تھی اور اب بھی ہے کہ حفاظ شریعت کے لیے مزید تیز رفتار مشینری تشکیل دی جائے۔

مثلاً اگر علماء پر مشتمل کوئی بورڈ تجویز کیا جاتا ہے تو اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ تو مقننہ کے اوپر مقننہ ہوگی۔ اور ایسا کرنا خلائی پارلیمانی نظام کی روح کے خلاف ہو گا کہ یہاں مقننہ سے اوپر کوئی دوسرا ادارہ تجویز ہو جو اسلام کے حوالے سے قانون سازی کرے۔ ۱۹۵۴ء کی دستوری سفارشات پر یہی اعتراض ہمارے مغرب زدہ بھائیوں کی طرف سے کیا گیا تھا۔

یہ اعتراض بالکل بے اصل ہے۔ اگر کوئی ایسا بورڈ یا ایجنسی قائم کر دی جائے، تو سوائے اس کے کہ اسلام کے حوالے سے قانون سازی کا عمل تیز ہو جائے گا، مقننہ کے حقوق میں سے کسی حق پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ اس لیے کہ اسلامی نظام جمہوریت میں خود مقننہ پر قیود عاید ہیں۔

اسلام کے حوالے سے اسلامی پارلیمان قرآن و سنت کے خلاف یا فقہاء کے مسلم اجتہادات کے خلاف کوئی قانون نہیں بنا سکتی۔ اس لیے کہ موجودہ مقننہ کی حالت تو یہ

ہے کہ وہ روزمرہ کے کام میں بھی ایک کاتب (سکریٹری) کی محتاج ہے۔ اُسے یہ منصب تو نہیں سونپا جاسکتا کہ وہ ایک فقیہ کی طرح اجتہاد کر سکے۔ ہماری موجودہ پارلیمنٹ ایک کاتب کا تیار کردہ مسودہ ہی پاس کر دیتی ہے اور وہ اس قدر ناخوش ہوتا ہے کہ پیش کرنے کے دوسرے ہفتے ہی اس میں ترمیمات شروع ہو جاتی ہیں، لہذا اگر پارلیمنٹ سے اوپر قانون سازی کا کوئی ادارہ قائم کر دیا جائے تو اس سے موجودہ پارلیمنٹ پر اسلامی حوالے سے کوئی حرف نہیں آئے گا۔

مثلاً موجودہ ہائی کورٹوں کے جج صاحبان، سپریم کورٹ کے جج صاحبان، اسلامی مشاورتی کونسل کے ممبران اور ان کے علاوہ سرکردہ علماء اور ماہرین قانون اسلامی مدارس کے قانون کے نمائندوں اور پاکستان بار کونسل کے نمائندوں پر مشتمل ایک ادارہ قائم کر دیا جائے جو اسلامی حوالے سے قوانین میں ترمیم کا حق رکھتا ہو جس طرح سول پروسیجر میں ہائی کورٹ اپنے آرڈر نافذ کرتے رہتے ہیں، تو اس طرح اسلامی قانون سازی کا عمل تیز تر ہو جائے گا۔

ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مقننہ مسودات قانون کی منظوری سے پہلے اس ادارے سے چیک کرائے، تاکہ اسلامی حوالے سے یہ مسودات تقاضے سے پاک ہوں اور ایسی صورت حال پیش نہ آئے کہ مسودہ پاس ہوتے ہی اس میں ترمیم کا عمل شروع ہو جائے۔



جسٹس تنزیل الرحمن کے اہم فیصلے

ضیاء الحق سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ قرارداد مقاصد کو دستور کے اندر داخل کر دے تاکہ وہ عدالتوں کے ذریعے قابل نفاذ ہو جائے۔ یہ مسئلہ عاصمہ جیلانی کیس اور ضیاء الرحمن کیس میں بھی زیر بحث آیا تھا۔ اور غالباً ریفرنڈم کے موقع پر امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد نے بھی ان سے یہ مطالبہ کیا تھا، چنانچہ دستور میں ترمیم کر کے اُسے آرٹیکل ۲ (الف) کی شکل میں دستور کا حصہ بنا دیا گیا۔ اس کی اساس پر کراچی ہائی کورٹ کے محترم جج جناب تنزیل الرحمن نے، بعض موضوعات پر اسلامی قانون کے مطابق فیصلے دئے۔ یہ بہت ہی اہم فیصلے ہیں اس لیے ہم بعض فیصلے نقل کرتے ہیں ان کا خلاصہ ترجمان القرآن لاہور سے دیا گیا ہے

مبارک پراچہ بنام بینک آف اومان

جسٹس تنزیل الرحمن نے ۱۰۲ صفحات پر مشتمل اپنے فیصلے میں مختلف اعلیٰ عدالتوں بشمول وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ آف پاکستان کے فیصلوں سے استفادہ کرتے ہوئے اور ان فیصلوں کے حوالے دیتے ہوئے یہ قرار دیا کہ قرارداد مقاصد کو آئین کا قابل نفاذ حصہ قرار دئے جانے کی وجہ سے پاکستان میں نافذ قوانین کو شریعت اسلامی، یعنی قرآن و سنت کے منافی ہونے کی بنا پر کالعدم قرار دینے کے معاملے میں اعلیٰ عدالتوں کے اختیار کی بابت ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۸۵ء تک قرارداد مقاصد آئین میں تمہید کے طور پر درج تھی جب کہ ۳۰ دسمبر ۱۹۸۵ء سے اسے آئین کے آرٹیکل ۲۱-اے کے تحت آئین کا ایک قابل نفاذ حصہ بنا دیا گیا ہے۔ فاضل جج نے اس تبدیلی کے بعد قرارداد مقاصد کو قوانین شریعت کے مطابق یا قرآن و سنت کے منافی ہونے کا جائزہ لینے کے بارے میں کوئی قرار دیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اعلیٰ

عدالتیں آئین کی پابند ہیں اور کوئی بھی قانون جو آئین کے منافی ہو ناجائز، بے اثر اور لائق تنسیخ ہے۔ قرار داد مقاصد کے اصول اور دفعات آئین کی ۱۲ اے کے تحت اب آئین کا حصہ اور عدالتوں کے ذریعے قابلِ مذاقہ ہیں لہذا کوئی قانون اور خود آئین کا کوئی حصہ اگر قرار داد مقاصد کے منافی ہو تو اعلیٰ عدالتیں اسے بھی ناجائز اور منسوخ قرار دے سکتی ہیں، تاہم یہ اختیار آئین کی دفعات ۲۰۳ اے، بی، پی، ۲۰۳ ڈی اور ۲۰۳ جی کے تابع ہے، جن کے تحت وفاقی شرعی عدالت کو یہ خصوصی دائرہ اختیار تفویض کیا گیا ہے کہ وہ دفعہ ۲۰۳ بی (سی) ۲۰۳ جی کے مفہوم کے مطابق کسی قانون کو اسلامی اصولوں، یعنی قرآن کریم اور سنت رسولؐ کے منافی قرار دے۔

فاضل جج نے اس ضمن میں اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ ”میرے سامنے جو مسئلہ زیر بحث ہے وہ ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ ۱۸۸۲ء کی دفعہ ۵۸ ایف کے تحت رہن کے ایک معاہدے سے تعلق رکھتا ہے جس کا جائزہ قرار داد مقاصد کے اصولوں کی روشنی میں لینا ضروری ہے“ فاضل جج نے وفاقی شرعی عدالت کے ایک فیصلے کا حوالہ دیا ہے جس میں وفاقی شرعی عدالت یہ قرار دے چکی ہے کہ اس قانون میں ماسوائے ان دفعات کے جن کا تعلق سود کے معاملے سے ہے، کوئی اور دفعہ قرآن و سنت کے منافی نہیں، لہذا میں اس فیصلے کا پابند ہوں، تاہم رہن کے معاملات میں جن پر اسلامی نقطہ نظر سے اس فیصلے کے دوسرے حصے میں تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے، میں اس کے برعکس نتیجے پر پہنچا ہوں اور وہ نتیجہ ہے ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ ۱۸۸۲ء کی دفعہ ۵۸ ایف قرآن و سنت کے احکام کے منافی ہے۔ فاضل وفاقی شرعی عدالت اگر چاہے تو اسے اس بارے میں اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی ضرورت کا جائزہ لینا چاہیے“

فاضل جج نے اپنے اس تاریخی فیصلے کے آخری پیرا گراف میں لکھا ہے کہ ”درخواست زیر بحث کی سماعت کے دوران آخری مرحلے پر یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ بینکنگ کمپنیز (ریگوری آف لونز) آرڈی نینس ۱۹۷۹ء بھی غیر اسلامی ہے اور اس عدالت کو چاہیے کہ اس قانون کو منسوخ اور کالعدم قرار دے۔ مسٹر خالد انیم اسحاق ایڈووکیٹ اور مسٹر محمد علی سید ایڈووکیٹ نے اس موضوع پر جو دلائل پیش کیے ہیں ان میں خاصا وزن ہے، محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

لیکن اس معاملے کا جائزہ مقدمے کی باقاعدہ سماعت کے دوران لینا مناسب ہو گا۔ اس وقت میں صرف سی پی سی کے آرڈر ۳۷ رولز ۳ کے تحت درخواست پر فیصلہ دے رہا ہوں۔“

فاضل جج نے اس درخواست کی سماعت کے دوران مدعی بنک آف اومان کے وکیل مسٹر حبیب الرحمن باریٹ لاء درخواست دہندہ مسز مبارکہ پراچہ کے وکیل مسٹر محمد علی سید ایڈووکیٹ کے دلائل سننے کے علاوہ عدالت کے مشیر کے طور پر آئینی امور اور قانون کے ممتاز ماہر مسٹر خالد ایم اسحاق ایڈووکیٹ اور اتارنی جنرل جنرل آف پاکستان مسٹر علی احمد فضیل کو بھی دلائل پیش کرنے کی دعوت دی تھی۔

ان فاضل وکلاء کے دلائل اور اس دوران اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں کے حوالہ جات اور اسلامی قوانین اور فقہ کے اصولوں کے بارے میں ائمہ کرام فقہاء، مفسرین قرآن کی مستند تصانیف سے مفصل اور طویل حوالہ جات فاضل جج نے اپنے اس امر پر فیصلہ کن بحث کی ہے کہ اسلام لین دین بالخصوص قرضے کے معاملے میں املاک یا جائیداد کو رہن رکھنے کی اجازت کن حالات میں اور کن شرائط کے تحت دیتا ہے۔ اور ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ کے تحت رہن کی کیا نوعیت اور شرائط ہیں اور زیر بحث مقدمے میں معالجہ رہن کی کیا صورت ہے۔

فاضل جج نے اس سلسلے میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسلام میں رہن کی اجازت رکھی جانے والی املاک کا قبضہ مرہن کو دئے جانے سے مشروط ہے، یعنی اسلام رہن بلا قبضہ کی اجازت نہیں دیتا جب کہ مقدمہ زیر سماعت میں جائیداد کو بچائے اس کے کاغذات ملکیت مرہن کے حوالے کئے گئے ہیں اور اسی ضمن میں فاضل جج نے ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ کی دفعہ ۵۸ ایف کے قرآن و سنت کے منافی ہونے کے مسئلے کا جائزہ لیا ہے۔

فاضل جج نے اپنے فیصلے میں پاکستان کی آئین سازی کی تاریخ کا ایک تفصیلی جائزہ بھی پیش کیا ہے اور اس بات کو واضح کیا ہے کہ آئین پاکستان میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا جو اقرار کیا گیا ہے اور اس کے تحت یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی

اور اجتماعی زندگی قرآن حکیم اور سنت نبویؐ کی روشنی میں اسلامی اصولوں کے مطابق بسر کرنے کے قابل بنایا جائے گا۔ اس عہد کے مطابق جو قرارداد مقاصد کی شکل میں مجلس دستور ساز نے مارچ ۱۹۴۹ء میں منظور کی تھی۔ یہ قرار دیا گیا کہ مملکت پاکستان اپنے اختیار و اقتدار کو جو اللہ تعالیٰ کے اقتدارِ اعلیٰ کے تحت اسے تفویض ہونے میں عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔ اسی قرارداد میں ماسوائے دوسرے اصولوں کے، یہ بات بھی شامل ہے کہ حدیہ مکمل طور پر آزاد ہوگی۔ فاضل جج نے لکھا ہے کہ قرارداد مقاصد کی منظوری تاریخ پاکستان میں ایک سنگ میل اور زرخیز باب کے آغاز کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے پاکستان کی نظریاتی بنیاد رکھی گئی۔ اس قرار داد کی روشنی میں مارچ ۱۹۵۶ء کے آئین کے باب ایک پر اگر آف ۱۲ کے تحت دفعہ ۱۹۸ (۱) میں یہ درج کیا گیا ہے کہ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جاسکے کہ جو قرآن و سنت کے متعین کردہ اسلامی اصولوں کے منافی ہو۔ اور تمام موجودہ قوانین کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالا جائے گا۔

فاضل جج نے بعد میں ہونے والی تبدیلیوں اور آئینی اقدامات کا جائزہ لیتے ہوئے ان تمام فیصلوں اور اقدامات کا ذکر کیا ہے جو قوانین کو اسلام کے مطابق بنانے کے سلسلے میں مختلف حکومتوں کے دور میں کیے جاتے رہے۔ ان میں اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کا قیام بھی شامل ہے۔ فاضل جج نے اپنے فیصلے کے پر اگر آف ۳۵ میں صدر ضیاء الحق کے صدارتی حکم نمبر ۱۲ کا حوالہ دیا ہے، جس کے ذریعے ایک نئی دفعہ ۲ اسے کا اضافہ (۲ مارچ ۱۹۸۵ء سے اطلاق کیا گیا۔ اس دفعہ میں کہا گیا ہے کہ قرارداد مقاصد کے اصول اور اس کی دفعات کو جیسا کہ ضمیمے میں درج کی گئی ہیں، آئین کا بنیادی حصہ بنایا جا رہا ہے اور اسی کے مطابق ان کا اثر اور نفاذ ہو گا۔) بعد ازاں فاضل جج نے آئین کی ان دفعات کا جائزہ لیا ہے جن کا تعلق قوانین کو اسلام کے اور اسلام کے منافی قوانین کو کالعدم اور منسوخ کرنے کے طریقہ کار سے ہے۔ ان دفعات اور طریقہ کار کے تحت وفاقی شرعی عدالت کے خصوصی اختیارات کا ذکر کرتے ہوئے ان حدود و قیود کو بیان کیا ہے جو وفاقی شرعی عدالت کے لیے بعض قوانین کو غیر اسلامی یا قرآن و سنت کے منافی محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

قرار دینے کی راہ میں حائل ہیں۔ اس میں آئین کی دفعہ ۲۰۳ بھی شامل ہے۔ جو وفاقی شرعی عدالت کو خصوصی دائرہ اختیار عطا کرتے ہوئے یہ واضح کرتی ہے کہ وفاقی شرعی عدالت آئین پاکستان مسلم پر سنل لا اور آئین کی دفعہ ۳۔ اے کے مفاد کے دس سال کے عرصے تک کسی مالیاتی قانون اور فیکس اور محصولت عاید اور وصول کرنے سے متعلق قانون اور بینکنگ اور انشورنس سے متعلق قانون اور مروجہ طریقے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں دے سکے گی۔

فاضل جج نے لکھا ہے کہ وفاقی شرعی عدالت ان پابندیوں کے باوصف اگر کسی قانون کو قرآن و سنت کے منافی قرار دے دے تو اس کے فیصلے کی تاریخ سے وہ قانون منسوخ، کالعدم یا غیر مؤثر ہو جائے گا۔ لیکن شرعی عدالت آئین کے تحت ایسے قانون یا اس کے کسی غیر اسلامی حصے کی جگہ متبادل قانون بنانے کی مجاز یا مکلف نہیں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مسلمہ آئینی اور جمہوری اصولوں کے مطابق قانون سازی کرنا عدالتوں کا کام ہے، یہی نہیں۔ شرعی عدالت کی اس پوزیشن کی مثال یوں ہے کہ فرض کیجیے کہ عدالت تحریکات پاکستان کی دفعہ ۳۰۲ کو قرآن و سنت کے منافی قرار دے دے اور فیصلہ کر دے کہ قتل کا جرم اسلامی اصولوں کے مطابق قابل راضی نامہ ہے۔ اس لیے یہ دفعہ قرآن و سنت کے منافی ہے تو عدالت اس فیصلے کے بعد قصاص اور ویت کا اسلامی قانون وضع یا جاری یا نافذ نہیں کر سکتی۔

فاضل جج نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ یہ اسکیم اس وقت بھی تھی جب قرار داد مقاصد کو آئین میں تمہید کی حیثیت حاصل تھی اور اب دفعہ ۲۰۳ کے تحت اسے آئین کا قابل مفاد حصہ قرار دے دیا گیا ہے۔ تب بھی آئین کی متعدد دفعات کی روشنی میں یہی صورت حال موجود نظر آتی ہے۔ فاضل جج نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ قوانین کو غیر اسلامی قرار دے کر منسوخ کرنے اور ان کی جگہ اسلام کے مطابق قانون وضع یا نافذ کرنے کے معاملے میں جو خلا نظر آتا ہے، کیا عدالتیں اسے پورا کر سکتی ہیں، یا اعلیٰ عدالتیں کسی ایسی آئینی دفعہ کو جو قرار داد مقاصد کے منافی ہے یا اس کے مفاد کی راہ میں حائل ہے، خلاف یا ناجائز اور منسوخ قرار دے سکتی ہیں؟ فاضل جج نے لکھا ہے کہ جہاں تک میری عدالت کا

تعلق ہے۔ تو یہ سوال میرے سامنے اٹھایا گیا ہے اور نہ ہی میرے خیال میں مجھے اس پر فیصلہ دینے کی کوئی ضرورت ہے۔ فی الحال میں ہائی کورٹ کی اور سیشنل سائیڈ پر ایک دعویٰ کی سماعت کر رہا ہوں، جس کا تعلق بکننگ کمپنیز (ریگوری آف لونز) آرڈی نینس ۱۹۷۹ء کے بارے میں عدالت کے دائرہ اختیار سے ہے۔ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر دستور سازوں نے قرار داد مقاصد پر عمل درآمد کے سلسلے میں آئینی خلا کو پُر کرنے کا کوئی طریقہ تجویز نہیں کیا تو کیا عدالتیں اس خلا کو پُر کر سکتی ہیں؟ میرے خیال میں ایسا کرنا عدالتوں کی طرف سے آئین کی تشریح کے پردے میں قانون سازی کے اختیارات کے ناجائز استعمال کے مترادف ہو گا۔

فاضل جج نے مقدمہ حاجی نظام خان بنام ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج میں لاہور ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس محمد افضل ظلم (اب سپریم کورٹ کے جج) کے ایک فیصلے کا حوالہ دیا ہے، جس میں قرار دیا گیا ہے کہ موجودہ آئینی نظام کے تحت ہمارا آئین عدالتوں سے بعض شعبوں میں اسلامی اصولوں کے مفاد کا تقاضا کرتا ہے۔ اور بعض شعبوں میں ان کے استعمال اور اختیار کو محدود کرتا ہے۔ آئین کے تحت یہ ہلت کہ تمام قوانین کو اسلامی اصولوں کے مطابق بنایا جائے گا اور یہ کہ کوئی قانون قرآن و سنت کے منافی نہ بنایا جائے آئین کے دفعہ ۲۲ (ii) کے تحت ہی رو بہ عمل لائی جاسکتی ہے، جس کے لیے اسلامی نظریے کی کونسل قائم کی گئی ہے۔ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ عدالتوں سے مطالبہ کرے کہ وہ قوانین کو اسلام کے مطابق بنائیں، اس لیے کہ انہیں ایسا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ موجودہ قوانین جیسے کچھ بھی ہیں ان کو نافذ کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر ضابطہ تعزیرات پاکستان میں غیر اسلامی دفعات موجود ہیں، لیکن عدالتیں محض اس بنا پر ان کو نافذ کرنے یا ان پر عمل کرنے سے انکار نہیں کر سکتیں کہ یہ دفعات اسلامی اصولوں کے منافی ہیں۔

فاضل جسٹس سٹیزیل الرٹمن نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ آئین کی دفعہ ۲۶۸ (۶) کی قانونی پوزیشن جیسا کہ مسٹر جسٹس ظلم کے مندرجہ بالا فیصلے میں بیان کی گئی ہے۔ اب تبدیل ہو چکی ہے۔ آئین کی دفعہ ۲۱۷ کے ذریعہ قرار داد مقاصد کو آئین کا حصہ بنادینے

سے اعلیٰ عدالتیں نہ صرف اس بات کی مجاز ہو گئی ہیں، بلکہ اُن پر یہ فرض عائد ہو گیا ہے کہ وہ قرآن و سنت کی روشنی میں، جیسا کہ آئین تمقاضا کرتا ہے، موجودہ قوانین کے قرآن و سنت کے منافی ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کریں۔ ماسوائے اس کے کہ کوئی قانون خصوصی طور پر واقعی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار میں آتا ہو۔ فاضل جج نے مزید لکھا ہے کہ اس معاملے میں خالد اسحاق ایڈووکیٹ اور مسٹر محمد علی سید ایڈووکیٹ نے یہ واضح کیا کہ وفاقی شرعی عدالت اگر کسی قانون کو قرآن و سنت کے منافی قرار بھی دے دے تو وہ اس قانون کے نفاذ سے متاثر اور عدالت میں آنے والے فریق کو کوئی سہولت، رعایت یا فیض نہیں پہنچا سکتی۔

فاضل جج نے اس مسئلہ پر وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس گل محمد کے ایک مقالے سے طویل اقتباسات پیش کئے ہیں، جو انہوں نے پانچویں بیورو سٹ کانفرنس مارچ ۱۹۸۶ء منعقدہ کراچی میں پڑھا تھا۔ اس مقالے کے متعلق حضوں اور دیگر اعلیٰ عدالتوں کے چند فیصلوں کا حوالہ دیتے ہوئے فاضل جج نے مسٹر جسٹس گل محمد کے مقالے کے اس حصے پر بحث کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ واقعہ ۱۲ اے کے تحت قرارداد مقاصد کو قابل نفاذ قرار دینے کا منطقی نتیجہ یہی ہونا چاہیے کہ عدالتیں اس کے تحت انصاف طلب کرنے والوں کو انصاف بھی دے سکیں۔ جب کہ وفاقی شرعی عدالت بعض صورتوں میں جن کا پہلے ذکر آچکا ہے ایسا اختیار نہیں رکھتی۔ (آئینی قوانین، مالیاتی امور، سود، بینک اور انشورنس سے متعلق قوانین وغیرہ وغیرہ)

جسٹس گل محمد کا کہنا ہے کہ اگر اللہ کی حاکمیت کو نافذ ہوتا ہے جیسا کہ قرارداد مقاصد اور آرٹیکل ۱۲ اے کا تمقاضا ہے تو ان سے مستثنیٰ قوانین کے معاملہ میں بھی عدالتوں سے رجوع کرنے والوں کو فیصلہ اور انصاف ملنا چاہئے۔ آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت اعلیٰ عدالتیں اس بات کی مجاز ہیں کہ کسی درخواست دہندہ یا فریق متاثرہ کی درخواست پر کسی سرکاری افسر یا حاکم کو کوئی ایسا کام کرنے سے باز رہنے کا حکم جاری کریں، جو قانون کے مطابق اُسے نہیں کرنا چاہئے، یا کسی ایسے فعل یا اقدام کے خلاف جو قانون کے منافی ہو، درخواست دہندہ کو فوری یا عارضی تحفظ، سہولت یا مفاد فراہم کریں، منطقی طور پر یہ

نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی مجلس قانون ساز کا بنایا ہوا کوئی قانون اللہ کی حاکمیت کے تصور یعنی قرآن و سنت کے احکام کے منافی ہو تو اس کو ناجائز اور غیر قانونی قرار دے دیا جائے، جب کہ وفاقی شرعی عدالت صرف ایک محدود دائرے میں یہ کام کر سکتی ہے اور کسی کو رعایت بھی نہیں دے سکتی، جبکہ اسکے برعکس ہائی کورٹوں کے دائرہ اختیار میں، سوائے مسلح افواج کے ایسا کوئی استثنا نہیں ہے اور وہ عدالت سے رجوع کرنے والے کو رعایت، سہولت یا مقاد بھی دے سکتی ہیں۔ اس لیے موجودہ صورت میں اعلیٰ عدالتیں نہ صرف کسی قانون کو غیر اسلامی قرار دینے کی مجاز ہیں، بلکہ عارضی یا مستقل ریلیف بھی دے سکتی ہیں۔ دریں حالات وفاقی شرعی عدالت کے ذریعے فیصلوں کے نظام کو نا کافی سمجھتے ہوئے لوگوں کو یہ حق دیا جانا چاہئے کہ وہ شریعت و پیشین جیسے معاملات کو بھی عام رٹ پیشین کی شکل میں ہائی کورٹ کے سامنے لے جاسکیں۔

فاضل جج نے مزید لکھا ہے کہ اٹارنی جنرل نے اس بحث میں سندھ ہائی کورٹ کے فل شیج کے ایک فیصلے کا حوالہ دیا ہے جو محمد بچل میمن بنام گورنمنٹ آف سندھ نامی مقدمہ میں دیا گیا ہے۔ میں نے رجسٹرار کے دفتر سے اس فیصلہ کی نقل منگو کر اس کا مطالعہ کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فاضل اٹارنی جنرل معاملے کو مؤثر طور پر سامنے نہیں لاسکے۔ بہر حال مطلب یہ تھا کہ آئین کی دفعات کو قرارِ داوِ مقاصد کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جاسکتا۔ اس فیصلے میں جس کا اصل فیصلہ فاضل جسٹس محمد ظہور الحق نے لکھا ہے اور اس سے جسٹس چودھری عبدالقدیر نے اتفاق کیا ہے، لیکن اس فیصلے میں دفعہ ۱۲ اے کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے، البتہ فاضل چیف جسٹس اور جسٹس علی مدد شاہ اور جسٹس حیدر علی پیر زادو کے فیصلے میں دفعہ ۱۲ اے کا ذکر ملتا ہے لیکن یہ ذکر دوسرے پس منظر میں آیا ہے، یعنی یہ کہ آئین کی ایک دفعہ (۱۲۰ اے) میں ترمیم کو ایک اور دفعہ ۱۲ اے کے ذریعے نہیں پرکھا جاسکتا، لیکن یہ مسئلہ میرے سامنے زیر بحث مسئلے کے متعلق نہیں ہے۔

فاضل جج نے اس بحث اور تحقیقات کی روشنی میں درخواست زیر بحث پر فیصلہ دیا کہ درخواست و بند و مسز مبارکہ پر اچہ کے بھگہ کو جس کی مالیت سات لاکھ روپے دستاویزات بینک آف اومان کے سپرد کرتے وقت تھی، ستر لاکھ روپے کے قرضہ کی ضمانتوں میں سے

خارج کر دیا جائے۔ جیسا کہ وہ اپنے فیصلہ میں ثابت کر چکے ہیں کہ اسلام رہن بلا قبضہ کی اجازت نہیں دیتا۔ اور اس قرضے سے متعلق ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ کی دفعہ ۵۸ ایف کو بھی انہوں نے قرآن و سنت کے منافی قرار دے دیا۔

ارشاد خان اور جیب بینک کے مقدمات

سنہ ۲۰۰۵ء ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس تنزیل الرحمن نے جو قبل ازیں بینک آف اومان بنام ایسٹ ٹریڈ بینک کمپنی کے مقدمہ میں مسز مبارکہ پراچہ کی درخواست پر تاریخی فیصلہ دے چکے ہیں کہ اصلی عدالتیں آئین کی دفعہ ۲ اے اور قرار داد مقاصد کے تحت قرآن و سنت کے منافی کسی بھی قانون کو کالعدم اور منسوخ قرار دے سکتی ہیں، اب دو الگ الگ مقدمات کے فیصلوں میں قرآن کی رو سے سود کے حرام ہونے کی بنا پر قابل بیع و ستاویزات، یعنی پرومیزی نوٹ بل آف اسٹیٹ بینک وغیرہ سے متعلق قانون نیگوشی ایسیل انسٹرومنٹ ایکٹ ۱۸۸۱ء کی دفعات ۸۰، ۷۹، اور ضابطہ دیوالی کی دفعہ ۳۲، آرڈر نمبر ۳ کی دفعہ ۲ کو قرآن و سنت کے منافی قرار دیتے ہوئے کالعدم کر دیا ہے۔ ان دفعات کی رو سے عدالتیں قرضوں پر سود کی ادائیگی اور سود کا تعین کرنے سے متعلق احکامات صادر کر سکتی ہیں۔

فاضل جج نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ یہ قوانین اور ان کی متعلقہ دفعات نہ صرف قرار داد مقاصد کی زد میں آتی ہیں، بلکہ یہ مسلمانوں کو قرآن و سنت کے عین مطلق زندگی بسر کرنے سے روکتی ہیں۔ اس لیے یہ عدالت ان قوانین کے تحت ایسا کوئی فیصلہ اور حکم جاری نہیں کر سکتی جو ان کے مفاد اور ان پر عمل درآمد سے تعلق رکھتا ہو۔ فاضل جج نے ان نتیجعات قانونی کی بنا پر مقدمہ ارشاد احمد خان بنام مسز پروین اعجاز میں ایک لاکھ نوے ہزار کی قابل وصول اصل رقم جمع پندرہ فیصد سود کی ادائیگی کے دعوے کو صرف اصل زر کی حد تک منظور کیا ہے اور سود کی رقم کو جس کا ذکر پرومیزی نوٹ میں درج تھا، قرآن و سنت کے منافی ہوتے ہوئے مسترد کر دیا۔ سود کی حرمت کے متعلق قرآن کریم کی آیات، احادیث نبوی اور مفسرین قرآن کے حوالہ جات کا تفصیل سے ذکر کرتے

ہیں۔ فاضل جج نے اس بات پر زور دیا ہے کہ سود کے متعلق ارشادات ربانی میں آخری اور واضح ارشاد یہ ہے کہ اگر تم سود کو معاف نہیں کرتے جو ماضی کے معاہدوں سے تمہارے حق میں بن گیا ہے اور آئندہ کے لیے اس کو ترک نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور اسکے بعد پھر ایک مشورہ قرآن میں آیا کہ تمہارے حق میں بہتر یہ ہے کہ صرف اصل زر کی وصولی پر اکتفا کرو اور پھر یہ انتہاء ہے کہ ہر شخص کو بالآخر یوم حساب اللہ کے حضور پیش ہونا ہے اور تب اُسے وہی کچھ ملے گا جو اُس نے دنیا میں کمایا ہے۔

فاضل جج نے اس امر پر بھی بحث کی ہے کہ بعض لوگ سود مفروک اور بڑا نہیں سمجھتے اور صرف سود مرکب کو ربوہ کی زد میں قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے یہ دلیل دی ہے کہ قرآن کریم نے جب یہ کہا (سورہ مائدہ ۴۴-۵) ”میری آیات کا معمولی معاوضہ پر سودا نہ کرو“ تو کیا اس کا یہ مطلب لیا جاسکتا ہے کہ بھاری یا زیادہ معاوضہ پر سودا کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں، یہ تو اندازِ بیان کی بات ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان کو ساری دنیا بھی آیاتِ قرآنی فروخت کرنے کے عوض پیش کی جائے تو وہ بھی کم ہوگی۔ اُسے یہ سودا نہیں کرنا چاہئے۔ اس لیے سود کے معاملے میں الفاظِ اضافہ مضاعفہ صرف اس وقت عالمِ عرب میں نافذ سودی نظام کے ذریعے دولت میں اضافے کی بے پناہ شرح کی شدت کو واضح کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ فاضل جج نے لکھا ہے کہ ربوہ کا لفظ سود کے لیے قرآن میں ایک عمومی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

فاضل جج نے بعد ازاں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اور مختلف عدالتوں کے فیصلوں میں اس موضوع پر کی گئی بحث اور قراردادِ مقاصد کو قابلِ ملاحظہ بنائے جانے کے اثرات سے متعلق خود اپنے سابقہ فیصلے مقدمہ بینک آف اومان بنام ریسٹ ٹریڈنگ کمپنی کے حوالہ سے یہ قرار دیا ہے کہ نیگوشی لیسٹرانسٹرومنٹ ایکٹ ۱۸۸۱ء کی دفعات ۷۹، ۸۰ اور ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۱۳۳ اور حکم نمبر ۴ کی دفعہ ۲ جہاں تک ان کا تعلق قرضہ کے طور پر دی گئی کسی رقم پر سود کی وصولی کے مطالبہ سے ہے۔ قرآن و سنت کے منافی اور قراردادِ

مقاصد کی دفعہ ۳ اور آئین کی دفعہ ۱۲ اے کے تحت ناجائز اور کالعدم ہیں۔ کیوں کہ مذکورہ قوانین اور دفعات پاکستان کے مسلمانوں کو سود کے معاملہ کی حد تک قرآن و سنت کے مطلق زندگی بسر کرنے سے روکتے ہیں، لہذا مذکورہ بالا قوانین اور ان کی متدکرہ دفعات کو یہ عدالت اپنے فیصلہ اور حکم کے ذریعے نافذ نہیں کر سکتی۔ فاضل جج نے لکھا ہے کہ میں آئین کی دفعہ نمبر ۱۸۹ کو بخوبی سمجھتا ہوں اور یہ بات میرے ذہن میں ہے کہ فاضل سپریم کورٹ کے فیصلے پاکستان کی عدالتوں کے لیے لائق تعمیل ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی میں آئین کی دفعہ ۱۲ اے کے تقاضوں کا بھی پابند ہوں۔ اور چونکہ میں یہ قرار دے چکا ہوں کہ قرارداد مقاصد اور دفعہ ۱۲ اے ایک بنیادی قانون، بلکہ مافوق آئین دستاویز ہے۔ اس لیے یہ دفعہ ۱۸۹ پر بھی حاوی ہے۔ اور ان فیصلوں پر بھی جو فاضل سپریم کورٹ نے دفعہ ۱۲ اے کے آئین میں شامل کیے جانے سے پہلے دیے تھے یا جن میں اس حقیقت پر غور نہیں کیا گیا۔ ان کے بارے میں بصدد ادب و احترام میری یہ ناچیز رائے ہے کہ وہ فیصلے بھی دفعہ ۱۲ اے کے تقاضوں کے تابع ہیں

دوسرا مقدمہ حبیب بینک بنام محمد حسین ہے حبیب بینک کی طرف سے دئے گئے دس لاکھ پر اصل زر کے علاوہ تقریباً نو لاکھ روپے سود کی وصولی کا دعویٰ کیا گیا ہے جس کے فیصلے میں فاضل جج نے جزوی طور پر سود کی ادائیگی کی ڈگری جاری کرنے سے انکار کرتے ہوئے سندھ ہائی کورٹ کے فل شیخ کے ایک فیصلے کی بنا پر بینکنگ کمپنیز (ریگوری آف اونرز) آرڈیننس ۱۹۷۹ء کو کالعدم قرار دینے کے معاملے میں دائر اختیار کی تحدید کی بنا پر اپنی بے بسی اور معذروں کا اظہار کیا ہے۔ فاضل جج نے لکھا ہے کہ آئین کی دفعہ ۲۷۰ اے جو اتفاق سے قرارداد مقاصد کو قابلِ نفاذ قرار دینے والی دفعہ ۱۲ اے کے ساتھ ایک ہی تاریخ میں آئین کا حصہ بنائی گئی ہے۔ اس دفعہ ۲۷۰ اے کے تحت بینکنگ کمپنیز آرڈی ننس کو قانونی تحفظ حاصل ہو گیا ہے جسے سندھ ہائی کورٹ نے بھی مقدمہ محمد پچل مین بنام حکومت سندھ (پنی ایل ڈی ۱۹۸۷ء ص ۲۹۶) کے فیصلے میں تسلیم کیا ہے، اس لیے کہ وہ عدالت عالیہ کے اس حکم کے پابند ہیں، تاہم انہوں نے یہ قرار دیا ہے کہ دفعہ ۱۲ اے کے نفاذ یعنی ۲ مارچ ۱۹۸۵ء سے مقدمہ نمبر بحث کے اندراج کی تاریخ یعنی ۳ جولائی

۱۹۸۶ء تک ایک قانونی نکتہ کی بنا پر سود کی ادائیگی کا کوئی جواز نہیں اس لیے انہوں نے تقریباً ۱۵ لاکھ روپے کی حد تک سود کی ادائیگی کے مطالبے کو قرآن و سنت کے منافی ہونے کی بنا پر اور قرار داد مقاصد کی زد میں آنے کی بنا پر مسترد کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ میں بادل ناخواستہ اس کے قبل کے عرصے کے سود کی ادائیگی کے بارے میں مدعی حبیب بینک کے حق میں حکم جاری کر رہا ہوں۔

فاضل جج نے جس طرح کے سود کو ناجائز قرار دینے کے معاملے میں بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے ادائیگی کا حکم جاری کیا ہے اس کے سود کی رقم تقریباً ۱۴ لاکھ روپے بنتی ہے اور چونکہ مدعا علیہ پہلے ہی مختلف مواقع پر اتنی رقم کی ادائیگی کر چکا ہے اس لیے دس لاکھ روپے اصل زر کی ادائیگی کے لیے ڈگری بعد اخراجات مقدمہ جاری کی جاتی ہے۔ اور اس رقم کی وصولی کے لیے مدعی کو حق ہو گا کہ ضمانت کے طور پر پیش کی گئی جائیداد کی فروخت سے رقم حاصل کرے۔

فاضل جج نے اس معاملہ میں دائرہ اختیار کی بنا پر اپنی جس بے بسی کا اظہار کیا ہے اس کی مثال کے طور پر اپنے تفصیلی فیصلے میں دلائل کے طور پر آزاد جموں و کشمیر ہائی کورٹ کے ایک فیصلہ کا بھی حوالہ دیا ہے، جو سردار عبدالرزاق بنام حکومت آزاد جموں و کشمیر (پنی ایل ڈی ۸۶ ص ۱۸۵ اے ج کے) نامی مقدمہ میں مسٹر جسٹس محمد اکرم خان نے دیا ہے۔ اور اس میں قرآن کریم کی آیات سورۃ بقرہ ۷۹۔ ۷۸ کا حوالہ دیا ہے فاضل جسٹس محمد اکرم خاں نے لکھا ہے:

”اللہ تعالیٰ کا ارشاد استناد واضح ہے کہ اس کے بعد کسی شکل میں بھی سود کے لین دین کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

لہذا ہم سود کی رقم (محکمہ امداد باہمی) کو دلانے سے اجتناب کر دیں گے۔ اس بارے میں ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ اعلان جنگ کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتے۔ ممکنہ امداد باہمی کو چاہیے کہ وہ قرض حسنہ سمجھ کر صرف اصل زر ہی وصول کرے۔ ہم محکمہ کو ۲۰۲ روپے کا سود بادل ناخواستہ دلتے ہیں۔ کیونکہ ثالث نے فیصلہ دیا ہے ورنہ یہ رقم بھی منافع نہیں“ (دستاویزات میں فیصلہ کا ذکر تھا)

فاضل جسٹس محمد اکرام اللہ خاں نے لکھا ہے کہ اگرچہ آزاد کشمیر میں احترام رمضان ایکٹ ، زکوٰۃ ایکٹ اور اسلامی تحریرات ایکٹ وغیرہ نافذ ہو چکے ہیں ۔ اور یہ سارے قوانین قرآن و سنت کے مطابق ہیں ، لیکن کنٹریکٹ ایکٹ ابھی موجود ہے اور اسے ابھی تک مشرف بہ اسلام نہیں کیا گیا ۔ اور ریلو کی ممانعت کے بارے میں ابھی تک کوئی قانون نافذ نہیں کیا گیا۔ اس لیے ہم (مدعا علیہ کے وکیل کی) اس دلیل سے اتفاق کرنے سے معذوری میں کہ آزاد کشمیر میں سود کی وصولی کی ممانعت کا قانون موجود ہے ۔ عدالت عظمیٰ آزاد کشمیر کا فیصلہ عدالت عالیہ کے لیے لائق تعمیل ہے ۔ اور عدالت عظمیٰ پاکستان نے بھی یہی قرار دیا ہے کہ جب تک مجلس قانون ساز کی طرف سے کوئی قانون پاس ہو کر نہ آجائے ، عدالتیں از خود کسی قانون کو خلاف شریعت قرار نہیں دے سکتیں ۔

فاضل جسٹس سترہیل الرحمن نے نیگوشی اہل انٹرومنٹ ایکٹ کی دفعہ ۶۹۔۸۰ اور ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۳۲ اور حکم نمبر ۳ کی دفعہ ۲ کو قرآن و سنت کے منافی قرار دینے اور منسوخ کرنے کا فیصلہ ۱۱ جون ۱۹۷۸ء کو سنایا تھا اور اسے قانونی حوالہ کے طور پر اشاعت کے لیے ۱۱ جون کو جاری کیا گیا۔

دوسرا فیصلہ مقدمہ جیب بینک بنام محمد حسین مقدمہ نمبر ۴۶۰-۱۹۸۵ء میں فاضل جج نے اپنا فیصلہ ۳۰/ جون ۱۹۸۷ء کو سنایا ہے اور اسے بھی قانونی حوالہ کے طور پر اشاعت کے لیے منظور کیا ہے ۔ جس کے ذریعے انہوں نے آئین کی دفعہ ۱۲۷ کے تحت سندھ ہائی کورٹ فل شیخ کے فیصلے کی روشنی میں بینکنگ کمپنیز (ریگوری آف کنٹر) آرڈی نینس ۱۹۷۹ء کو کالعدم اور قرآن و سنت کے منافی قرار دینے سے معذوری اور بے بسی کا اظہار کیا ہے ۔

فاضل جج نے قانون سود یعنی انٹرسٹ ایکٹ ۱۸۳۹ء کو بھی قرآن و سنت کے منافی ہونے کی بنا کالعدم قرار دیا ہے ۔ اس معاملہ میں عدالت کے دائرہ اختیار سے بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ آئین کی دفعہ ۲۰۲ بی کے مطابق کوئی عدالت بشمول سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ ان معاملات میں اختیار سماعت نہیں رکھتی جو وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار میں دیئے گئے ہیں ۔ اور جیسا کہ شرعی عدالت نے متعدد

فیصلوں میں خود قرار دیا ہے کہ مالیاتی قوانین اس عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں ،
لہذا عام دائرہ اختیار کی تمام عدالتیں ان تمام معاملات میں جو شرعی عدالت کے دائرہ اختیار
میں نہیں سماعت اور فیصلہ کا اختیار استعمال کر سکتی ہیں۔

اس بحث میں فاضل جج نے وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس محل
محمد کے اس مقالے کا حوالہ دیا جو انہوں نے پانچویں جیورسٹ کانفرنس منعقدہ کراچی
مارچ ۱۹۸۶ء میں پڑھا تھا۔ اور پی لیل ڈی ۱۹۸۶ء ص ۲۲۹ میں شائع ہوا ہے ، جس
میں جسٹس محل محمد نے کہا: ”فیڈرل شریعت کورٹ صرف اپنے دائرہ اختیار کے
معاملات میں قوانین کو اسلام کے منافی قرار دے سکتی ہے ، لیکن درخواست دہندہ یا
فریقین کو سہولت اور رعایت نہیں دے سکتی۔ جب کہ شریعت کورٹ کے برعکس ہائی
کورٹوں کے لیے، ماسوائے ملٹری قوانین کے اور کوئی استثنیٰ نہیں ہے اور وہ فریقین
مقدمہ کوریلیف اور فوری ریلیف بھی فراہم کر سکتی ہے۔“

لہذا نئی صورت میں ہائی کورٹ نہ صرف قوانین کو اسلام کے منافی قرار دے سکتی
ہیں، بلکہ درخواست دہندہ کوریلیف بھی دے سکتی ہیں، لہذا شریعت کورٹ کے ذریعے
اداری ناکافی ہے۔ جب فریقین ہر قسم کی رٹ اور شریعت پٹیشن بھی ہائی کورٹ میں
لے جاسکتے ہیں۔ اس طرح مجوزہ نوآئینی ترمیم بل کی تمام اہمیت ختم ہو جاتی
ہے۔ کیونکہ اس سے توجو فائدہ حاصل ہو سکتا ہے وہ استہابی ہے کہ شریعت کورٹ کو بھی
ممنوعہ دائرہ میں اختیار سماعت دے دیا جائے، لیکن فریقین کو وہاں سے ریلیف تو پھر
بھی نہ ملے گی اور انہیں بعد ازاں ریلیف کے لیے ہائی کورٹ میں جانا ہو گا۔

فاضل جج مسٹر جسٹس تنزیل الرحمن نے آئین کی دفعہ ۱۲۷ کے ذریعے مارشل لا
کے دور میں نافذ ہونے والے قوانین کو ملے ہوئے تحفظ کی بنا پر فیصلہ دیا ہے کہ بکننگ
کمپنیز (ریکوری آف لونز) آرڈی ننس ۱۹۷۹ء کو قرار داد مقاصد کی روشنی میں منسوخ اور
کالعدم قرار دینا ان کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔

اسی ضمن میں فاضل جج نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا ہماری پارلیمنٹ کو آئین کی دفعہ
۱۲ کے تحت عائد کردہ فرائض کی روشنی میں ایسے قوانین بنانے، ان کی توثیق
محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کرنے، انہیں قبول کرنے اور جائز قرار دینے کا اختیار ہے جو واضح طور پر اللہ کی حاکمیت اور قرآن و سنت کی بالادستی کے منافی ہوں؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے، تو کیا پھر ہماری پارلیمنٹ خلاف وضع فطری فعل کی اجازت دینے یا حرام کاری کو جائز قرار دینے یا محاکم اور شادی کے بغیر تعلقاتِ زن و شوہر کو درست فعل قرار دینے کے لیے قانون بنا سکتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر آخر پارلیمنٹ کس طرح بینکنگ کمپنیز (ریگوری آف لونز) آرڈیننس ۱۹۷۹ء جیسے قانون یا اگر آرڈی ننس نمبر ۵۹ آف ۱۹۵۰ء کو جواز کی سند اور توثیق عطا کر سکتی ہے، جو عدالت کو سود کی ادائیگی کا حکم جاری کرنے کا پابند بناتے ہیں، حالانکہ قرآن و سنت کی رو سے سود قطعاً حرام ہے اور جو اس کے لین دین سے اجتناب نہیں کرتے وہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے اعلانِ جنگ کے مرتکب قرار دیئے گئے ہیں۔ (سورت البقرہ - آیت ۲۷۹)



پانچواں باب

پاکستان کی اعلیٰ عدالتیں

- ہماری اعلیٰ عدالتوں کے بعض فیصلے
- اسلامی نظامِ حیات میں عدلیہ کے اختیارات
- عدلیہ اور اجتہاد

ہماری اعلیٰ عدالتوں کے بعض حالیہ فیصلے

ہمارے موجودہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کے ذہن پر اینگلو سیکسن نظام کا یہ تصور چھایا ہوا ہے کہ ججوں کو قانون سازی کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ یہاں میں اینگلو سیکسن نظام کے نظام ریاست میں اداروں کے صدور کے تصورات سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ہمارا قانونی اور دستوری نظام قرارداد مقاصد نے مکمل طور پر تبدیل کر دیا ہے، اس لیے اب ہماری اعلیٰ عدالتوں کو چاہئے کہ وہ اینگلو سیکسن تصورات کے شکنجے سے نکل آئیں اور اسلام کے نظام قانون اور نظام دستور کے تحت فیصلے صادر کرنا شروع کریں۔

اسلامی قانونی نظام میں مقننہ کا کوئی مقام نہیں۔ نہ مقننہ کے پاس کوئی وسیع ناقابل شکست اختیارات ہیں جن کی جکڑ بندیوں سے ہماری اعلیٰ عدالتوں کے جج نکل سکتے ہوں، اسلامی نظام میں مقننہ قرآن و سنت کے مقابلے میں کوئی قانون نہیں بنا سکتی۔ اگر کوئی ایکٹ مرتب ہو اور اس ایکٹ میں مقننہ کسی آیت، کسی حدیث پر کوئی نمبر لگا کر اسے دفعہ بنا دے تو اس سے مسئلہ نہیں بدل جائے گا۔ یعنی صرف (Codification) سے قرآن و سنت کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آجائے گا ہاں فرق اس صورت میں پڑتا ہے کہ ہم یہ تصور کریں اور اس پر ہمارا یقین ہو کہ قرآن و سنت کو اب بھی قانونی حیثیت اختیار کرنے کے لیے کسی صدر یا کسی پارلیمنٹ کی منظوری ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسا ضروری نہیں ہے۔ قرآن و سنت کو قانونی حیثیت دینے کے

لئے اسلامی قانونی تصورات کے مطابق کسی قوت محرکہ کی (Sanctioning authority) ضرورت نہیں ہے

اسلام کے قانونی اور دستوری مقام کے لیے قرارداد مقاصد کی منظوری ہی وہ واحد عمل ہے جس نے اس ملک کو (Garund Norm) دیدیا ہے۔ ۱۹۷۲ء کے بعد یہ نکتہ ہماری عدلیہ کے سامنے مختلف مقدمات کی سماعت کے دوران میں آیا ہے، لیکن ہمارے جج صاحبان اور ہمارے سینئر و کلاء لہ کلوسیکسن قانونی اور دستوری نظام کے اس تصور کی دلدل میں ابھی تک پھنسے ہوئے ہیں کہ وہ اسلامی قانون کو براہ راست کس طرح نافذ کریں، جبکہ وہ صرف جج ہیں اور ان کا مقام صرف یہ ہے کہ وہ قانون کی تشریح کرتے ہیں

میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کے دستوری نظام میں قرارداد مقاصد کے ذریعے اللہ رب العالمین کو مقتدر اعلیٰ اور اختیارات حکومت اسی کی طرف سے ایک مقدس امانت اور اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کی پابندی کا اقرار کر لینے کے بعد اب قرآن و سنت کو کسی اور مقتدر اعلیٰ کی جانب سے منظوری (Sanction) کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے اب ہمارے وکلاء اور اعلیٰ عدالتوں کے ججوں پر ایک دوسرا فریضہ بھی عاید ہو گیا ہے اور وہ فریضہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں اسلامی قانون اور اسلامی دستور کی ”نشاندہی“ بھی کس اس نکتے کو نہیں سمجھتے تو پھر ہم یہ بات واضح کر دیتے ہیں کہ اسلامی نظام میں قرآن و سنت کا مقام یہ نہیں ہے کہ اسے قانونی حیثیت حاصل کرنے کے لیے کسی صدر کے آرڈینینس یا دو ممبران پارلیمنٹ کی منظوری کی ضرورت ہو۔ قرآن و سنت کا مقام اس قدر فروتر نہیں ہے۔

قرآن و سنت کو قانونی حیثیت اختیار کرنے کے لیے، خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی منظوری کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”لم تحرم ما حل اللہ“ تم کیوں اس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال قرار دی ہے؟“ (۱:۶۶)

مولانا مودودی مرحوم فرماتے ہیں: ”یہ کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے حدود مقرر کرنے کے اختیارات قطعی طور پر اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور عام انسان تو درکنار خود اللہ

کے نبی کے لیے بھی ان کا کوئی حصہ منتقل نہیں کیا گیا۔ نبی بحیثیت نبی اگر کسی چیز کو حرام، حلال قرار دے سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا اشارہ ہو۔ قطع نظر اس سے کہ وہ اشارہ قرآن مجید میں نازل ہوا ہو یا وحی خفی کے طور پر کیا گیا ہو۔“ (۱)

عاصم دہلانی کیس میں قرار داد مقاصد کے سپریم قانون اور دستور ہونے کا فیصلہ اس لیے نہ ہو سکا تھا کہ ججوں کے ذہن میں یہی تصور میٹھا ہوا تھا کہ مقننہ اور دستور یہ نے اس قرار داد کو دستور سے باہر رکھا ہے اور وہ دستور کے پابند ہیں۔ لیکن اب تو سربراہ مملکت نے اس قرار داد کو آئین کا حصہ بھی بنا دیا ہے بلکہ انہوں نے اسلامیت (Islamization) کے لیے دستور کے اندر باب ۳ (۱) کے ذریعہ فیڈرل شریعت کورٹ اور سپریم شریعت بینچ کا نظام بھی وضع کیا ہے اور اس کے لیے طریقہ کار کے طور پر کچھ دفعات وضع کی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایک حالیہ فیصلے (سردار علی بنام محمد علی (۲)) میں، ہمارے محترم جج صاحبان ایک بار پھر یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ قرار داد مقاصد کے ذریعے وہ اسلام کے دستوری اور قانونی تصورات کو نافذ تصور کریں۔ اس راہ میں انہیں خود دستور میں تجویز کردہ اسلامیا نے (Islamization) کا طریقہ کار حائل نظر آتا ہے۔

تقدیر یہ ہے کہ اسلامیا نے کا طریقہ کار جو صرف فیڈرل شریعت کورٹ کے لیے وضع کیا گیا ہے اور جسے شریعت آرڈیننس کے ذریعہ تمام اعلیٰ عدالتوں کے لیے وسیع کر دیا گیا ہے۔ یہ پروسیجر درحقیقت اسلامی مشاورتی کونسل کا ایک ایڈوانس تصور اور طریقہ کار ہے۔ اور اس کے مطابق بھی جموں کو یہ اختیارات دیئے گئے ہیں کہ وہ عدالتوں میں تحقیقات کر کے اسلامی قانون کی نشاندہی کر دے اور اس کے بعد اس کے لیے ایک تاریخ مقرر کر دیں، جس کے بعد ماتحت عدالتیں اس پر عمل پیرا ہوں گی۔ اس تمام پروسیجر اور اسلامیا نے کے اس عمل کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے کہ اس کے ذریعے اسلام کے حقیقی قانون کی نشاندہی ہو رہی ہے اور اُسے صرف جموں کی یہ نشاندہی ہی قانونی مقام عطا

کر دیتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ دستور کے دفعہ ۲ (۱) یا براہِ راست قرار داد مقاصد کی روشنی میں ہماری اعلیٰ عدالتیں یہ کام کیوں نہیں کر سکتیں؟ کیا صرف اس لیے کہ مقننہ نے انہیں یہ اختیار نہیں دیا؟ اگر ہم یہ سوچیں گے تو پھر ہم قرآن و سنت کی حیثیتِ منفذہ میں کمی کر دیں گے، حالانکہ اسلامی نظام میں ایسا نہیں ہے۔ جب دستوری حیثیت سے اللہ رب العالمین پاکستان کا مقتدر اعلیٰ ہے تو اس کے قانون کو جاری کرنے کے لیے کسی دوسرے کی اجازت یا منظوری کا کیا سوال ہے؟

جج صاحبان کو اب یہ قرار دینا چاہیے کہ قرآن و سنت سپریم اور برتر قانون ہیں اور آزادانہ طور پر اسکی نشاندہی کرنا چاہیے۔ جب ایک مسلمان ایمان لاتا ہے تو قرآن و سنت اس کے لیے قانون و دستور بن جاتے ہیں اور جب ایک قوم ایمان لاتی ہے تو قرآن و سنت اس کے لیے از خود قانون بن جاتے ہیں۔ قرار داد مقاصد کی صورت میں ملت پاکستان بحیثیت ملت اور ریاست پاکستان بحیثیت مملکت ایمان لا چکے ہیں اور قرآن و سنت ہمارے لیے دستوری اور قانونی مقام حاصل کر چکے ہیں

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے قرار داد مقاصد پاس ہونے کے بعد جماعت اسلامی پاکستان کے ارکان سے کہا تھا کہ اب ریاست پاکستان اللہ کی حاکمیت اور اس کی وحدہ کے اندر رہ کر کام کرنے کا اقرار کر کے ایک اسلامی ریاست بن گئی ہے، اس لیے اب اس کی ملازمت جائز ہی نہیں عبادت کے درجے میں ہے۔ بشرطیکہ اسے دیانتداری اور فرض شناسی اور اخلاص سے انجام دیا جائے۔ اب ان تصورات و دستور و قانون کے مطابق ہماری عدالتیں قرآن و سنت کے قانون نافذ کر سکیں یا نہ کر سکیں، لیکن اسلام اب ماخذ قانون و دستور ہے۔

حالیہ شریعت آرڈیننس کی دفعہ ۳ میں بھی شریعت کو سپریم لا قرار دیا گیا ہے۔ سردار علی بنام محمد میں جج صاحب نے یہ حکم کیا ہے کہ اس سلسلے میں وکلاء نے ہماری صحیح راہنمائی نہیں کی۔ میرے خیال میں کسی ریاست میں، خود اپنے ٹکڑے ٹکڑے تصور قانون کے مطابق مآخذ قانون یہ ہوتے ہیں۔

(۱) حاکم کی طرف سے پاس شدہ ایکٹ اور فرامین۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

(۲) ان ایکٹوں کے تحت بنائے ہوئے قواعد

(۳) وہ رسوم اور رواجات جنہیں قانون کا مقام حاصل ہو

(۴) ججوں کا اختیار تیزی جو عدل پر مبنی ہو۔

اب جب شریعت آرڈیننس نے شریعت کو برتر و بالا مآخذ قانون قرار دیدیا ہے تو پھر اب عدالتوں کو آرٹیکل ۲(۱) کے تحت شریعت کے براہ راست مفاہیم کوئی سمجھک یا ظلمان نہیں ہونا چاہئے!

عدالتوں کے اندر، اپنے حدود اختیارات کے بارے میں جو ظلمان پایا جاتا ہے، وہ دراصل ایٹکلو سیکسن تصور قانون پر مبنی ہے اس تصور قانون کے مطابق تمام اختیارات کا اصل سرچشمہ بادشاہ ہوتا ہے، اس طرح گویا بادشاہ جج اور قاضی بھی ہوتا ہے اور وہ اپنے اختیار اب بذریعہ ایکٹ ججوں کی طرف منتقل کرتا ہے، لیکن اسلامی تصور قانون اور دستور کے مطابق خلیفہ اختیارات کا سرچشمہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ خود اپنے اختیارات قرآن و سنت سے اخذ کرتا ہے، اگر وہ کسی وقت قرآن و سنت کے حدود سے تجاوز کرتا ہے تو وہ قابل اطاعت نہیں رہتا۔

اسلامی تصور دستور کی رو سے عدلیہ عدالتی اختیارات براہ راست قرآن و سنت سے اخذ کرتی ہے اور یہ اختیارات اُسے، اسکے قیام کے ساتھ ہی حاصل ہو جاتے ہیں۔ گویا یہ اختیارات عدلیہ کے ذاتی (Inherent) ہیں۔

جسٹس عبدالحلیم اپنے حالیہ فیصلے میں، جسے سپریم کورٹ کی پوری تائید حاصل ہے یہ قرار دیتے ہیں کہ یہ اختیارات ان عدالتوں کو موجود دستور ہی نے دئے ہیں، ان اختیارات کے لیے انہیں کسی مافوق الفطرت مرجع یا کسی مقدس مرجع کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں (۱) ہے۔ محترم جسٹس عبدالحلیم صاحب اسی سسٹم، یعنی ایٹکلو سیکسن

(۱) لکھتے ہیں

This is a right which it acquires not, de hors its constitution but by virtue of the fact that it is a superior court set up by the constitution itself as a result of the system of division of power. It is not necessary for the purpose to invoke any divine super natural right but this judicial power is inherent in the court itself. It flows from the fact it is a constitutional court and can only be taken away by abolishing the court itself. PLD 1988 S.C (P 500)

سٹم کی طرف اشارہ کرتے ہیں ، حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اس سٹم میں اور اسلامی نظام قانون میں ، قانونی تصورات کا بہت بڑا فرق ہے۔ ہمارے ہاں اولی الامر خواہ وہ عدلیہ ہو ، مقننہ ہو یا انتظامیہ ، خواہ یہ اختیارات تقسیم شدہ ہوں یا فرو واحد میں ہوں یا مختلف ہوں۔ مثلاً مقننہ کو سپریم عدالت تصور کیا گیا ہو اور اُسے یا اسکی کمیٹیوں کو سپریم کورٹ کے فیصلوں پر بھی منظر ثانی کی اجازت دی گئی یا عدلیہ کو قانون سازی کے اختیارات دیئے گئے ہوں۔ مثلاً جیسے ہمارے فیڈرل شریعت کورٹ یا موجودہ شریعت آرڈیننس میں دیئے گئے ہیں۔ غرض تقسیم اختیارات کی جو بھی صورت ہو ، ہمارے اولی الامر قرآن و سنت کے پابند ہیں اور اسی حقیقت کا اظہار قرار داد مقاصد میں کیا گیا ہے۔

ہمارا کوئی اولی الامر چاہے وہ حج ہو ، قانون ساز ہو یا منتظم ہو ، ان میں سے کوئی بھی اگر قرآن و سنت سے باہر قدم رکھتا ہے ، تو وہ ناقابل ابطال ہے ، اسکا عمل غیر موثر ہے ، یہی صراطِ مستقیم ہے ، یہی ایک مستحکم اساس ہے ، اگر ہمارے حج اینٹکلوسیکسن قوانین کے دلدل سے نہ نکلے تو ایک دن کوئی طالع آزماسرے سے عدالتوں ہی کو ختم (Abolish) کر دے گا ، جس کے لیے اینٹکلوسیکسن تصورات کا پروردہ حج تو شاید تیار ہو سکتا ہے ، لیکن جس حج نے قرآن و سنت کے سرچشمے سے سیرابی حاصل کی ہو وہ کبھی اس کے لیے تیار نہیں ہو سکتا !!



اسلامی نظام حیات میں عدلیہ کے اختیارات

اسلامی قانون کا نزول اور اس کا شفاؤ قرنِ اول میں نہ رنج کے ساتھ ہوا۔ حضورؐ کی بعثت کے بعد حیاتِ مبارک کے پورے عرصہ میں وحی کے ذریعے احکام نازل ہوتے رہے اور ساتھ ساتھ اسلامی قانون کا ارتقاء بھی ہوتا رہا۔ حضورؐ کے دور میں ماتحت امراء کے فرائض میں انتظامی امور کے ساتھ ساتھ عدلیہ کے فرائض بھی شامل تھے۔ اکثر امراء قضا کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے تھے۔ بعد کے ادوار میں انتظامی امور کی وسعت پذیرگی کے ساتھ ساتھ عدلیہ، انتظامیہ سے علیحدہ ہوتی گئی۔

حضورؐ کی مبارک ذات میں دونوں مناصب کا اجتماع تھا، یعنی حضورؐ مقنن بھی تھے اور میثاقِ مدینہ کی رو سے سپریم جج بھی اور ساتھ ساتھ سربراہِ مملکت بھی۔ اس لیے ہم منصب رسالت کی خصوصیت کی وجہ سے کسی اور شخص کو وہ تمام اختیارات نہیں دے سکتے جو حضورؐ کو حاصل تھے۔ اسلامی تاریخ میں بعض لوگوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو سامنے رکھ کر بعض شخصیات کو ایسا مقام دینے کی کوشش کی، جس سے بہت بڑے فتنے پیدا ہوئے مثلاً برصغیر ہند میں ابوالفضل اور فیضی نے مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کو ایسا مقام دلانے کی کوشش کی، اور اس زمانے میں جناب غلام احمد پروفیسر نے مرکزِ ملت کا تصور پیش کر کے ہر کہہ و کہہ کو وہ اختیارات دینے کی کوشش کی جو صرف منصب رسالت کو حاصل تھے اور ان تحقیقات کے نتیجے میں امت میں بہت ڈولیدہ فکری کا اضافہ ہوا۔

اس لیے جدید اسلامی ریاست میں کسی ایسے تصور کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہمیں چاہئے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں اور اُن فقہائے کبار کے تصورات کی روشنی میں

جنہوں نے قرآن و سنت سے فہم حاصل کیا ایک ایسا نظام وضع کرے جس کے نتیجے میں احتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کے اختیارات اور حدود کار کا تعین ہو سکے، اس لیے کہ دور جدید کی ریاستوں میں یہ ادارے نہایت ہی منظم اور منضبط انداز میں چلتے ہیں۔

اسلامی تاریخ میں خلافت راشدہ کا دور مثالی دور ہے۔ اس دور میں جو سربراہان مملکت گذرے ہیں وہ حضور اکرم صی اللہ علیہ وسلم کے ممتاز صحابی تھے۔ جن کی اطاعت تمام دینی اور دنیوی امور میں حتیٰ الوسع ضروری تھی۔ حضور کے بعد، ان خلفائے راشدین کے دور میں، اسلامی عدالتوں نے کام شروع کر دیا تھا، یہ عدالتیں اپنے دائرہ کار میں ہر لحاظ سے آزاد تھیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ایک اسلامی عدلیہ کی حیثیت دائرہ کار اور دائرہ اختیارات کے تعین میں خلافت راشدہ کے طرز عمل سے مدلیں۔

سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اسلام کے اصول قانون کی تعین میں عدلیہ کا کیا کردار ہو سکتا ہے۔ اور مقننہ اور انتظامیہ اور احتظامیہ کے سربراہ کیا مقام ہے؟ یہ بات مسلمہ ہے کہ اسلامی نظام مملکت میں انتظامیہ اور احتظامیہ کے سربراہ (سربراہ مملکت تک) کی اطاعت غیر مشروط نہیں ہے، صرف اللہ اور رسول کی اطاعت غیر مشروط ہے اور اللہ اور رسول کی اطاعت شریعت کی صورت میں منضبط ہے اور شریعت کی رو سے انتظامیہ کے سربراہ کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ جو کام بھی کرے، جس کام کا حکم بھی دے، جو اصول اور قاعدہ بھی جاری کرے، چاہے وہ شوریٰ کے مشورہ سے ہو یا بلا مشورہ، ان سب میں اسکی اطاعت مقید اور مشروط ہے اور قید یہ ہے کہ وہ قرآن و سنت کے حدود کے اندر رد کر کام کرے اور اس کی کوئی بات شریعت کے خلاف اور شریعت سے متصادم نہ ہو۔ اگر کوئی بات بھی شریعت سے متصادم ہو تو مسلمانوں پر اسکی اطاعت لازم نہیں ہے اور اسے عدالتوں میں چیلنج بھی کیا جاسکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ فیصلہ کون کرے گا کہ حدود شریعت کیا ہیں؟ اسلامی تاریخ میں دو ایجنسیوں نے یہ کام کیا ہے۔ ایک طبقہ فقہاء جنہوں نے آزادانہ طریقوں سے شریعت اور شریعت کے مآخذ کو مدون کیا اور پھر ان نصوص پر غور و فکر کر کے شرعی حدود کو متعین کیا۔ ان میں محدثین اور فقہاء اور مفتی شامل ہیں اور دوسری ایجنسی قضا کی

تھی، یعنی اعلیٰ عدالتوں کے ججوں نے یہ کام کیا۔ ان عدالتوں نے پہلے طبقے، یعنی محدثین و فقہاء کی آراء کی روشنی میں فیصلے کیے اور ان فیصلوں نے قانون اور شریعت کا درجہ حاصل کر لیا۔ قرآن کریم میں ان دونوں ایجنسیوں کی قانونی اور شرعی حیثیت کے بارے میں نصوص موجود ہیں۔

فقہاء اور ماہرین کی شرعی حیثیت:

قرآن کریم نے ایمان کے بعد اہل علم کو صریحاً اونچا مقام دیا ہے: **وَالَّذِينَ آتَوْا الْعِلْمَ وَرَجَبْتَ** ”اور جن لوگوں کو علم بخشا گیا وہ مقام بلند کے مستحق ہیں“ (۱۱:۵۸)

ایک دوسری جگہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ کسی ناگہانی اور پیچیدہ صورت حال میں ہر مسلمان کو از خود کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے، ایسے معاملات کو ان لوگوں کے حوالہ کر دینا چاہیے جو اس میدان میں زیادہ معلومات رکھتے ہیں اور جو ایسے معاملات میں کوئی فیصلہ کرنے کے اہل یا قانوناً فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں: **(آیت) ”اَکْرَهُ اَسَے رَسُوْلُ اور اٰہِنِی جَمَاعَتِ کَے ذَمَّ وار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے، جو اُن کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں“ (۸۳:۴)**

ان دو آیات کے علاوہ قرآن نے بار بار اہل علم اور اصحاب الرائے کی تعریف کی ہے اور پیچیدہ معاملات کو ان کے سپرد کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس آیت میں اہل علم اور ماہرین کے ساتھ اولی الامر کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے یعنی وہ اہل علم جنہیں اپنی علمیت اور قابلیت کی بنا پر کسی شعبے کا انچارج بھی مقرر کیا گیا ہو۔ لہذا ایسے امور متعلقہ انچارج کے سپرد کئے جانے چاہئیں۔ اس میں اسلامی حدیہ بھی شامل ہے۔

اسلامی نظام میں جن لوگوں کو **تَفَقُّہٌ فِی الدِّیْنِ** کی وجہ سے جج مقرر کیا جاتا ہے اُن کے فیصلے امت کے لئے قابل اتباع مظائر کا درجہ رکھتے ہیں اور یہ بات صرف حدیہ تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ ہر شعبے کے ماہرین کی رائے کی اتباع ضروری ہے۔ چاہے وہ سیاسی اور اجتماعی معاملات ہوں یا ٹیکنیکل امور ہوں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اختیارات حاصل تھے کیونکہ آپ رسول برحق بھی

تھے اور میثاق مدینہ کی وجہ سے حاکم اعلیٰ بھی، چنانچہ تمام فیصلے حضور خود فرماتے تھے (۱) آپ کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں مدلیہ بالکل علیحدہ تھی اور خلفائے راشدین بھی اس کے دائرہ اختیار سے باہر نہ تھے، بسا اوقات خلفاء کو خود عدالت میں حاضر ہونا پڑتا اور وہ ایک عام فرو کے ساتھ عدالت میں مساویانہ طور پر کھڑے ہوتے تھے خلافت راشدہ کا دور تو بہر حال بابرکت اور مثالی تھا، لیکن اسکے بعد بھی مسلمان حکمرانوں نے عدالتوں کا احترام کیا اور ہمیشہ عدالتی فیصلوں کو نفع دیا ہے۔ بادشاہوں اور فاتح جرنیلوں تک نے ہمیشہ حامی شریعت ہونے کا حلف اٹھایا اور عادت المسلمین کو یہ یقین دلایا کہ وہ شریعت کے محافظ رہیں گے، سب ہی مسلمانوں نے ان کی حکمرانی کو تسلیم کیا، چاہے یہ حکمران اسلامی نقطہ نظر سے جائز ذرائع سے اقتدار پر آئے تھے یا ناجائز طریقوں سے انہوں نے اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔

قانون کی حکمرانی

قرآن کریم نے ہر مسلمان پر لازم کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام امور میں عموماً اور اپنے مابین اٹھنے والے تنازعات میں خصوصاً شریعت کی پابندی کرے۔ شریعت کی پابندی کی یہ روح انت مسلمہ میں رچی بسی رہی۔ ہمیشہ اسلامی معاشرہ میں شریعت بطور قانون (Civil Law) نافذ رہی۔ اگرچہ گزشتہ دو سو سال کے زمانے میں جب یورپی اقوام نے غلبہ حاصل کیا شریعت کو ہمارے عدالتی نظام سے خارج کر دیا گیا تاہم اسلامی معاشرے اکثر فیصلے، علماء کرام سے مساجد ہی میں کراتے رہے۔ اور اکثر اہل اسلام نے اپنے تنازعات کا ایک بڑا حصہ اپنی بستیوں کے علماء کرام سے ہی کر لیا۔ اور رضا کارانہ طور پر تنازعات کے فریقین نے عالم دین کا فیصلہ بخوشی قبول کیا۔

اسلامی معاشرے میں یہ روایات قرآن و سنت کی ان ہدایات ہی کا نتیجہ ہیں جن میں مسلمانوں پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ شریعت کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم کر دیں :

”فصلت کے لئے دیکھئے اقصیہ الرسول، الفرق الثانی لسی شائع کردہ ادارہ معارف اسلامی لاہور“

لایئمنون حتی یحکموا فی ما شجر بینہم ”یہ کہ مومن نہ ہوں گے جب تک وہ آپ کو حکم نہ بنائیں اُن تنازعات میں جو ان کے درمیان اٹھیں“ (۶۵:۴)

یہ تو حکمِ تعامُّم لوگوں کے لیے کہ وہ اپنے تنازعات اسلامی عدالت میں لے جائیں ، لیکن دوسری جانب مسلمان جموں پر بھی لازم کیا گیا ہے کہ ان کے پاس اگر کوئی تنازعہ آئے تو وہ کتب و سنت ، یعنی شریعت کے مطابق فیصلہ کریں : وان احکم بینہم بما انزل اللہ ”ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ کرے“ (۴۹:۵)

عدلیہ کا مقام

اسلامی نقطہ نظر سے عدلیہ کا مقام بہت ہی بلند ہے ۔ قرآن نے ایک جج کو اللہ اور رسولؐ کا جانشین قرار دیا ہے : فان تنازعتم فی شئ ، فردوہ الی اللہ والرسول ”اگر تمہارے درمیان کسی چیز پر تنازعہ ہو جائے تو اُسے اللہ اور رسول اللہ کی طرف لوٹاؤ“ یہاں یہ امر بہت ہی اہم ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے ۔ حضورؐ کے دور میں تو تمام مقدمات از روئے میثاقِ مدینہ حضورؐ کی طرف لوٹائے جاتے تھے اور اس آیت پر عمل ہوتا تھا ، لیکن ذاتِ باری کی طرح لوٹانا تو اس وقت بھی ممکن نہ تھا ، اس لیے قرآن کریم نے حکم دیا کہ : من اطع الرسول فقد اطاع اللہ ”جس نے رسولؐ کی اطاعت کی گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی“ (۸:۴) لیکن حضورؐ کی وفات کے بعد اب ہم کس فورم کو اللہ اور رسولؐ کا فورم کہہ سکتے ہیں؟

اسلامی تاریخ میں درباری اہل علم نے ، اپنے ماحول سے متاثر ہو کر ، یہ مقام خلفاء اور سلاطین کو دیا۔ السلطان العاقل ظل اللہ فی الارض (بادشاہِ مملکت عادلہ زمین پر اللہ کا سایہ ہوتا ہے) حالانکہ نصوص کی یہ نہایت ہی غلط تعبیر تھی ۔ قرآن و سنت میں ملوک و سلاطین اور خلفاء کو یہ مقام نہیں دیا گیا ، بلکہ امراء و سلاطین کی اطاعت کو مشروط قرار دیا گیا ہے کہ اگر حکمران درست ہو (قرآن و سنت کے مطابق ہو) تو اطاعت فرض ہے ورنہ نہیں ۔

صحیح بات یہ ہے کہ خدا اور رسولؐ کا جانشین فورم صرف عدلیہ ہے ۔ جن احادیث میں

السلطان کو ظل اللہ کہا گیا ہے اُن میں السلطان کے ساتھ العادل کی صفت لکائی گئی ہے ، یعنی سلطنت کا وہ شعبہ ظل اللہ ہے جو عوام الناس کو عدل فراہم کرتا ہے ، چاہے کرسی عدالت پر کوئی بادشاہ بیٹھا ہو یا قاضی ہو ۔ اس لیے کہ بعض اوقات خود سلطنت کے سربراہ کو بعض عدالتی فیصلے کرنے ہوتے ہیں ۔ لہذا آیت مذکورہ میں تنازعات کا جو مرجع بتایا گیا ہے آج اسکا اطلاق قضاۃ اور عدالتوں پر ہو گا ۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام عدالت میں ججوں کو ویناوی اور اخروی تحفظ دیا گیا ہے ۔ ایک جج اگر دیانت داری سے اور نیک نیتی سے (In Good Faith) غلط فیصلہ بھی کر لیتا ہے تو نہ صرف اس سے ہرجانہ وصول نہیں کیا جاسکتا بلکہ آخرت میں بھی وہ اجر کا مستحق ہو گا ، بشرطیکہ اس نے دیانت داری سے فیصلہ کرنے کی پوری کوشش کی ہو ۔ اور فیصلہ صحیح ہو تو اسے آخرت میں دوگنا اجر ملے گا ۔

عدلیہ اور اجتہاد

اجتہاد و تقلید اسلام کے قانونی نظام کا ایک اہم مسئلہ ہے ۔ ہمارا قانونی نظام اجتہاد پر مبنی ہے اس لیے کہ قرآن و سنت میں اسلامی قانون ، وفعات کی شکل میں نہیں نازل ہوا ، قرآن و سنت کی ہدایات کے مطابق اُسے فقہاء نے مرتب کیا ہے اور یہ کام انہوں نے صرف اجتہاد کے ذریعہ کیا ہے ۔ اس لیے اجتہاد اسلامی قانون کی جان ہے ۔ اگر قرآن و سنت میں کوئی مسئلہ صراحتاً موجود نہ ہو تو ابو موسیٰ اشعری کی مشہور حدیث کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتہاد کرنے کا حکم دیا ہے حضور کا حکم ہے کہ اگر نص نہ ہو تو جج اپنی رائے سے فیصلہ کرے ۔

اپنے منصب کے اعتبار سے ہر جج ایک طرح کا مجتہد ہوتا ہے ۔ وہ واقعات مقدمہ پر قانون کا انطباق اور اطلاق کرتا ہے اور یہ ایک قسم کا مسلسل اجتہاد ہوتا ہے ۔ ہر مفتی جو نئے واقعات پر مسائل ، فقہاء کی آراء اور مظاہر کا انطباق کرتا ہے اور مسائل و سوالات کے مطابق فتویٰ دیتا ہے درحقیقت اجتہاد کر رہا ہوتا ہے ۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ دلائل و براہین سے مؤین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفتی ان لائن مکتبہ

ہے کہ اس کا اجتہاد بہت ہی دقیق اور غیر محسوس ہوتا ہے۔ وہ اپنے کام کو اقوال فقہاء و منظر قضائے نیک محدود رکھتا ہے، لیکن اسکے کام کی نوعیت ایک قسم کا اجتہاد ہی ہے۔

آج کل ہمارے قانونی ماہرین غیر سودی بنکاری کا نظام وضع کر رہے ہیں۔ یہ اجتہاد کی اعلیٰ ترین قسم ہے، اگرچہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ لوگ اجتماعی طور پر اجتہاد کرتے ہیں۔ سمینار منعقد ہوتے ہیں ان کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ ان نتائج کی اساس پر علی نظام تجویز ہوتے ہیں اور بینک وجود میں آجاتے ہیں جن کے تجربات ہمارے سامنے آتے ہیں۔

غرض جن لوگوں نے ماضی میں یہ تجویز کیا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے، انہوں نے بھی درحقیقت ایک عظیم اجتہاد کیا۔ اجتہاد تو خود حضورؐ نے رائج فرمایا۔ جائز فرمایا۔ آج ہم حضورؐ کی سنت کو کیسے بند کر سکتے ہیں تاہم اس مسلک کی بھی یہ توضیح کی جاسکتی ہے کہ ہر کس و ناکس دین کے معاملات میں خود رانی کا طریقہ اختیار نہ کرے۔ اجتہاد بند کرنے والے علماء نے جب یہ دیکھا کہ لوگ اجتہاد اس لیے نہیں کر رہے کہ وہ شریعت کا منشاء معلوم کر سکیں اور شریعت کے اصل حکم کا اتباع کریں، بلکہ انہوں نے اجتہاد کے نام سے زندگی شروع کر دیا ہے۔ شریعت سے فرار اختیار کر لیا ہے یہاں تک کہ بعض صوفیوں نے شریعت کو ظاہریت سطحیت اور تنقش قرار دیکر اصل مقصد باطنیت، روحانیت اور نفسیاتی تجربات کو قرار دیا اور یوں اجتہاد کر کے ظاہری شریعت کے اتباع کو غیر ضروری قرار دیا۔ اس لیے اس دور کے فقہاء نے سرے سے اجتہاد کو بند کر کے سابق فقہاء کے اقوال کے اتباع کو فرض قرار دے دیا یہ ان لوگوں کا بروقت اور عظیم اجتہاد تھا جس کے ذریعہ انہوں نے وقتی طور اس اجتہاد کو بند کیا۔ جس کے ذریعہ لوگ شریعت سے فرار اختیار کرتے تھے۔ ہمارے دور میں بھی ایسے بہت سے مجتہدین پیدا ہوئے۔ ایک نام نہاد مجتہد نے ایسا اجتہاد کیا کہ اس نے سرے سے عقیدہ ختم النبوت ختم کر کے سلسلہ رسالت کو از سر نو جاری کر دیا۔

ایک اور صاحب اٹھے اور انہوں نے اجتہاد کر کے سنت کی آئینی حیثیت کو چیلنج کر دیا اور قانون سازی کا اختیار مرکز مملکت کو دیدیا۔

زمانہ قدیم میں بھی اخوان الصفاء ، باطنیہ ، صوفیاء وغیرہ پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے اجتہاد کیے لیکن چونکہ یہ اجتہاد شریعت کو قائم کرنے کے لیے نہیں کئے گئے تھے بلکہ ان اجتہادات کا منشاء شریعت سے جان چھڑانا تھا ۔ اس لیے جن لوگوں نے سلسلہ اجتہاد کو بند کیا ، انہوں نے دراصل شریعت کے تحفظ کے لیے ایک عظیم اجتہاد کیا ۔ اسلامی قانون کا معاملہ ایسا ہے کہ قرآن کے نزول کی تکمیل اور سنت رسول کی تکمیل کے ساتھ ہی دین مکمل ہو گیا ، قانون سازی مکمل ہو گئی ۔ لہذا اب استواء قرآن و سنت ہی کا اتباع کرے گی ۔ ہاں ایسے معاملات میں جو دور قدیم میں نہ تھے اہل لوگ اجتہاد کرس گے ۔ ظاہر ہے کہ یہ کام اجتہاد کے بغیر نہیں ہو سکتا اور عام معاملات میں اجتہاد کے مواقع سب سے زیادہ جموں کو حاصل ہوتے ہیں ۔ بلکہ اس سے بھی پہلے ایک تھانیدار اجتہاد کرتا ہے ، اس کے پاس جو رپورٹ درج ہوتی ہے اس پر وہ اپنی جانب سے اپنے علم کے مطابق قانون کا انطباق کرتا ہے کہ صورت جرم یہ نظر آتی ہے اور اس پر فلاں دفعات یا اصول لازم آتے ہیں اس کے بعد جب وہ تحقیقات مکمل کر کے بمسٹرٹ اور جج کے پاس ریکارڈ لے جاتا ہے تو پھر بمسٹرٹ اور جج فرد جرم عاید کر کے عمل اجتہاد شروع کر دیتے ہیں اور تھانیدار کے اجتہاد میں رد و بدل کر کے دفعات میں حذف و اضافہ کرتے ہیں اسی طرح سول عدالت میں ایک جج تحقیقات وضع کر کے اجتہاد کرتا ہے اور ہائی کورٹ تک یہی عمل جاری رہتا ہے ۔

غرض اسلام کے قانونی نظام میں جموں کے لیے اجتہاد ضروری ہے اور ہم تسلیم کرس یا نہ کرس یہ عمل جاری رہتا ہے ۔ اسی عمل کے نتیجے میں پھر قانونی نظام میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں لہذا اسلامی حوالہ سے جموں کے لیے بہترین قابلیت کا ماسب و نا ضروری ہے ۔



ضمیمہ

- شریعت بل
- شریعت بل کے بارے میں خدشات
- شریعت آرڈیننس

مجوزہ شریعت بل کے بارے میں بے بنیاد خدشات

اس وقت وطن عزیز میں مجوزہ شریعت بل زیر بحث ہے۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو تشکیل پاکستان کے بعد مسلسل اس جگہ و دو میں لگا ہوا ہے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام عمل میں نہ آئے۔ ایسے لوگوں سے ہمیں کوئی بحث نہیں ہے اور نہ ہی ان سے کلمہ ہے۔ دوسرا محاذ ان لوگوں کا ہے جو اس ملک میں شریعت کا نفاذ چاہتے ہیں۔ یہ لوگ اس وقت دو کیمپوں میں بٹے ہوئے ہیں، ایک کیمپ وہ ہے جو محض رشائے الہی کے حصول کے لیے اس بل کو پیش کرنے والا ہے اور اس کی تائید کرنے والا ہے اور جو اس کے پاس کرانے کے لیے بیہم سرگرم عمل ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے جو یہ چاہتا ہے کہ یہ بل اس صورت میں پاس ہو کہ ہمیں اس کا کریڈٹ اس دنیا میں ملے۔ اس گروہ کے سامنے مشکلات یہ ہیں کہ یہ موجودہ حکومت کو یا تو تسلیم ہی نہیں کرتا یا وہ اس کے مخالف کیمپ میں دھنسا ہے لہذا اس کے لیے سیاسی طور پر یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس بل کے موید بن میں شامل ہو جائے لیکن اپنی خفت مٹانے کے لیے یہ گروہ اس بل کے خلاف نہایت عجیب و غریب باتیں کرتا ہے مثلاً یہ کہ اس سے ۱۹۷۳ء کا دستور کمزور ہو جائے گا، یہ کہ اس سے فرقہ واریت پیدا ہوگی۔ خدا تعالیٰ ان لوگوں کو معاف کرے اور ان کو صحیح سوچ عطا کرے۔ ایسے لوگوں میں سے بعض نے تو شریعت بل کے خلاف مظاہرہ بھی کر ڈالا ہے۔ اسے کاش! کہ وہ اپنی اس حرکت پر اس کے ارتکاب سے پہلے ہی غور کر محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

لیتے۔ کیا ایک مسلمان ایسی حرکت کر سکتا ہے کہ شریعت بل پاس نہ ہو۔ انہوں نے غور نہیں کیا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

نفاذِ شریعت کے لئے متحدہ کوشش

شریعت بل ایسے انداز میں مرتب کیا گیا ہے کہ ہر دینی حلقوں کے لیے قابل قبول ہے اس لئے اختلافات کے باوجود اس کے نفاذ کے لیے متحدہ جدوجہد ہونی چاہئے۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے اگر کوئی بات ہمارے درمیان مشترک ہے تو اس کی خاطر ہم متحدہ سعی کر سکتے ہیں، بلکہ دوسرے مذاہب کی وہ باتیں اور نظریات جو ہمارے اور ان کے درمیان مشترک ہیں، ان کے لیے بھی مشترک جدوجہد کی جاسکتی ہے۔ یا اہل الکتاب تَعَاوُزًا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ مِّمَّا اٰہَلُ الْکِتَابِ اٰذ۔ ان باتوں پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہیں“ اسلامی فقہ اور اسلامی شریعت کے بارے میں صورتِ حال یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی اور دوسری سیاسی جماعتیں اور مختلف مذہبی طبقے دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث شیعہ سب اس کے قائل ہیں۔ کیا یہ تمام حضرات شریعت کے نفاذ کے لیے مشترک جدوجہد نہیں کر سکتے۔ جبکہ قرآن مجید اہل کتاب کے ساتھ بھی متفق علیہ مسائل میں اشتراک کی دعوت دیتا ہے۔

شریعت سب کا مشترک سرمایہ ہے

میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ اسلامی عناصر کو چاہیے کہ وہ اسلام کے بارے میں کوئی ایسی پالیسی اختیار نہ کر دیں جس کی وجہ سے پاکستان کی دوسری پارٹیاں اسلام کو کسی ایک جماعت کا ساوگن قرار دے کر اسلام سے دُور ہوں۔ چہ جائیکہ کوئی اسلامی جماعت اسلام کے نفاذ کے خلاف مظاہرہ کرے، یا اس مطالبے سے لا تعلق ہو جائے۔ دیکھئے ابوجہل نے حضورؐ کے مقابلے میں یہی تو پالیسی اختیار کر لی تھی کہ بنی ہاشم نے ہم سے فلاں فلاں چیز تو لے لی کیا اب ہم ان میں ہتھیاری بھی مان لیں۔ اہل دین کو محض سیاسی عصبيت کی وجہ سے دین کے خلاف محاذ نہیں بنانا چاہئے۔ ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ اُنکی یہ عزت و شان

صرف دین اور اسلام کی وجہ سے ہے۔ شریعتِ ہل کی مخالفت کر کے دراصل یہ لوگ اپنے وجود کی نفی کر رہے ہیں۔ اپنی شناخت کھنوار ہے ہیں۔

اسلامی شریعت کی تعریف

بعض لوگوں کو اسلامی شریعتِ ہل کی تعریف پر اعتراض ہے۔ ان کو خطرہ یہ لاحق ہو گیا ہے کہ اس تعریف (Definition) کی وجہ سے شریعت میں اجماع، قیاس اور فقہاء کے اجتہادات بھی شامل ہو جائیں گے۔ ہمیں چاہئے کہ ان حضرات کے اس خدشے پر ذرا غور کریں، معلوم ہو گا کہ یہ بالکل ایک عجیب بات ہے۔ فقہاء کے اجتہادات بہر حال اسلامی شریعت میں داخل ہوں گے اور یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ قانون دان حضرات جانتے ہیں کہ قانون کی تعریف میں بعض اوقات افسرانِ مجاز کے احکام، سرکولر اور قواعد (By Laws) کو بھی داخل کر دیا جاتا ہے۔ اگر مرشل لاک کی تعریف میں وہ تمام احکام (Orders) بھی داخل کر دیئے جائیں جو کسی زون کا مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جاری کرتا ہے تو آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں لیکن امام ابو حنیفہؒ کے اجتہادات پر اعتراض ہے، موجودہ دستور کی رو سے ہمارے ہائی کورٹ کے ۱۰۰ سے زیادہ ججوں کے فیصلے تو ماتحت عدالتوں کے لیے قانون ہیں، لیکن اگر آپ گھبراتے ہیں تو امام شافعی اور امام ابو حنیفہؒ کے کسی فیصلے سے۔ حالانکہ ان ججوں کے بعض فیصلے عجیب و غریب ہوتے ہیں اور اکثر اوقات سپریم کورٹ انہیں مسترد یا ان میں رد و بدل کر دیتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں فقہاء کے اجتہادات بہر حال فقہ کے اجزاء ہیں۔ ہر عدالت کو اختیار ہے کہ وہ ان اجتہادات کی تشریح کرے۔ اگر متضاد ہیں تو ان سے ہر بنائے دلائل ایک کو لے اور دوسرے کو رد کر دے جس طرح آج بھی عدالتوں میں رواج ہے کہ بعض مظاہر (Authorities) کو لے لیا جاتا ہے اور بعض کو رد کر دیا جاتا ہے۔ لیکن کسی کے لیے یہ کہنے کا جواز نہیں ہے کہ پنجاب کی عدالتوں کے لیے دستور نے پنجاب ہائی کورٹ کی مظاہر کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابندی کیوں لگائی ہے۔ یہ ایک

نہایت غیر معقول بات ہوگی۔ از روئے دستور ہر ماتحت عدالت کے لیے ہائی کورٹ کی نظیر پر عمل کرنا لازم ہے۔ مزید برآں یہ کہ اب اسلامی نظریاتی کونسل نے متعلقہ دفعات کی اس انداز سے اصلاح کر دی ہے کہ یہ اعتراض سرے سے ختم ہو جاتا ہے اور شکوک و شبہات میں مبتلا بعض دینی حلقوں کو بھی اب اس اصلاح کے بعد اس بل پر شرح صدر ہو گیا ہے۔

فرقہ واریت

بعض حضرات نے اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ شریعت بل کے نتیجے میں کئی شریعتیں وجود میں آجائیں گی اور ملک کے اندر فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوگی۔ یہ خدشہ بھی محض انسانی فتنہ سے لاعلمی کی بنیاد پر ہوا ہے۔ پاکستان میں فرقہ واریت کی اساس اسلامی قانون نہیں ہے۔ فرقہ واریت علمی زندگی میں اختلافات کی بنا پر نہیں ہے۔ بلکہ توحید و رسالت کے بارے میں عقائد کی تعبیر کی بنا پر ہے۔ دیوبندی بریلوی دونوں حنفی ہیں اور اہل حدیث اور شیعہ بھی مطلقاً اسکے مخالف نہیں ہیں اور عقائد میں تعبیرات کے اختلاف کا قانون سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قانونی مسائل میں سری معلومات کی حد تک بہت کم اختلاف ہے، اسی طرح اہل حدیث، حنفیوں کے ساتھ ان کے اختلافات آمین بالکچر، رفع یدین وغیرہ عبادات سے متعلق ہیں۔ قانون کے دائرے میں شیعوں اور سنیوں کے مابین بھی بہت ہی کم اختلافات ہیں۔ بلکہ فقہ زیدیہ، جعفریہ اور فقہ حنفیہ میں بھی زیادہ فرق نہیں ہے۔ معلوم نہیں اسلامی شریعت کے نفاذ سے فرقہ واریت کس طرح وجود میں آجائے گی۔ یہ ایک ایسا خدشہ ہے جسکی کوئی قانونی اساس نہیں ہے بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر شریعت نافذ ہو جائے تو اس کے نتیجے میں فرقہ واریت کم ہو گی۔ چونکہ شریعت نافذ نہیں ہے اور علماء عدالتوں فتویٰ نویسی اور قضاے فارغ ہوتے ہیں۔ لہذا ان کے لیے فرقہ وارانہ مسائل میں کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر شریعت بل پاس ہو جائے اور فتویٰ کا نظام جاری ہو جائے تو علماء کو ان مسائل پر بحث کرنے کی فرصت ہی نہ ملے گی۔ اور وہ نہایت ہی تعمیری کاموں میں مشغول ہوں گے۔

ہماری عدالتیں اور جج

ایک خدشہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر شریعت بل پاس ہو جائے تو ہمارے ججوں کے لیے شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا مشکل ہو گا۔ یہ ایک ایسا خدشہ ہے جسکی کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہے۔ تمام موجودہ جج اچھی خاصی قابلیت رکھتے ہیں۔ پھر ہر جج کو ہر مقدمہ میں دو وکلاء کی امداد حاصل ہوتی ہے۔ جن لوگوں کا عدالتوں سے تعلق ہے وہ جانتے ہیں کہ تمام عدالتوں اور وکلاء کے اندر اسلامی علم کے حصول، اسلامی شریعت کی تلاش اور اسلامی فیصلے کرنے کا ایک جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ اگر انہیں مطلوبہ لٹریچر فراہم کر دیا جائے تو ہر مقدمہ کا فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ابتدائی عدالت ہی میں کیا جاسکتا ہے۔ اگر دو وکلاء اور جج کو مشکل درپیش ہو تو فریقین مقدمہ علماء سے فتویٰ لاسکتے ہیں۔ خود جج کسی سینئر وکیل سے بھی مشورہ لے سکتا ہے۔ بالعموم عدالتوں میں ایسا ہوتا رہتا ہے پھر بھی اگر جج غلطی کر بیٹھتا ہے تو عدالت ضلع اور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ موجود ہیں۔ شرعی نقطہ نظر سے ہر مقدمہ پر وہ نظر ثانی کر سکتے ہیں اور یوں ساتھ ساتھ ہائی کورٹس میں ہر مسئلے پر نظائر بنتے چلے جائیں گے اور ایک مختصر عرصے میں علا شرعی نظام بنتا چلا جائیگا۔

شریعت بل اور دفعہ بندی (Codification)

بعض حضرات نے یہ دلیل دی ہے کہ چونکہ اسلامی موضوعات پر قانون کی ضابطہ بندی نہیں ہے، اس لیے شریعت بل کے نفاذ سے افراتفری پیدا ہوگی دفعہ بندی (Codification) کا انتظار ہونا چاہئے۔

سوال یہ ہے کہ اس کوڈی فیکیشن کا ہم کب تک انتظار کریں گے۔ اس راہ میں کی حقیقی رکاوٹیں موجود رہی ہیں۔ ہماری موجودہ نظامت قانون (Law Department) نااہل لوگوں پر مشتمل ہے۔ وہ تو سرے سے سلام اور اسلامی قانون سے واقف ہی نہیں۔ ماضی میں اسلامی نظریاتی کونسل پر تجدد پسندوں کا غلبہ رہا ہے اور اس میں محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

نمائندگی محض سیاسی بنیادوں پر دی جاتی تھی، یا ان لوگوں کو دی جاتی تھی جن کا علم ہویا نہ ہو البتہ وہ عالم مشہور ہوں۔ پھر اس ادارے میں جدید معاشرتی رجحانات کے حامل متضاد الخیال لوگوں کو جمع کیا جاتا تھا۔ یعنی ایک شخص قدامت پرست ہے تو دوسرا سرے سے سُنت کا قائل ہی نہیں ہے اور تیسری طرف ایک عورت ہے جو صرف اپنی آزادی اور عریانی کی عینک سے شریعت کو دیکھتی ہے اور پھر وہ ایسی شریعت چاہتی جس میں مرد وزن برابر ہوں۔ ایسے ملفوظ میں کوئی کیا دفعہ بندی کر سکتا تھا، لیکن گزشتہ ۸ سالوں میں اسلامی نظریاتی کونسل نے قوانین پر نظر ثانی کر کے انہیں کافی حد تک مقید بنا دیا ہے جس کا اظہار قومی اسمبلی میں ان رپوٹوں پر بحث کے دوران ہوا۔ حکومت کو چاہئے کہ ان رپورٹوں کو کتابی شکل میں عدالتوں کو فراہم کر دے۔ یہ عدالتوں کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔

دوسرے یہ کہ جدید نظریات کے مطابق بین الاقوامی قانون دان حضرات کی رائے تو یہ ہے کہ سرے سے (Codification) کا عمل ہی غلط ہے۔ امریکہ میں اس موضوع پر دو بین الاقوامی کنونشن ہو چکے ہیں اور ان میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ قانون کی دفعہ بندی مناسب نہیں ہے۔ یہ ایک الگ اور طویل موضوع ہے، ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے مثلاً ایک نہایت ہی شریف آدمی جو اپنی دکان پر بیٹھا ہے اس کے پاس ایک شخص آتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ یہ سامان اپنے پاس رکھیں میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔ اس سامان سے ۳۰۳ روپے کی بندوق اس دکاندار سے برآمد ہو جاتی ہے۔ اب عدالت اڑ روئے قانون اس بات کی پابند ہے کہ اس شخص کو تین سال سزائے قید دے، ایک دن بھی حدِ اُلت اس کی سزا کم نہیں سنا سکتی۔ حالانکہ مجسٹریٹ محسوس کرتا ہے کہ یہ شخص بے گناہ ہے۔ اس نے کبھی کوئی خلافتِ قانون حرکت نہیں کی ہے۔ لیکن برآمدگی (Recovery) کی وجہ سے کیس ثابت ہے۔

اسلامی قانون کے شعبہ تعزیرات میں تو سزا قاضی اور مجسٹریٹ کی صوابدید پر ہے۔ اس لیے اختلاف اس میں ہے کہ آیا مقننہ ہر جرم کے لیے عدالت کو کسی مقررہ سزا کا پابند بھی بنا سکتی ہے یا نہیں۔ بین الاقوامی کنونشنوں اور اسلامی قانون کے صحیح ماہرین کا

خیال ہے کہ اسلامی قانون کی یہ ایک خوبی ہے کہ اس کی دفعہ بندی نہیں کی گئی اور تعزیر ہوئی ہی وہ سزا ہے جو مقرر نہ ہو۔ اس لیے ہر قاضی ہر مقدمہ کے حالات کے مطابق سزا تجویز کرنے میں آزاد ہو سکا۔ لہذا یہ بات قرین مصلحت ہے کہ سرے سے اسلامی قانون کی (Codification) ہی نہ کی جائے۔ کم از کم نفاذ میں تو انتظار نہ کیا جائے۔ نفاذ شریعت کے حوالے سے ہندوستان کے قانونی نظام میں تو اسکی مثال اور تجربہ بھی موجود ہے۔ مثلاً قانون نفاذ شریعت ۱۹۳۵ء (Sharia Application Act) میں اسلام کا شخصی قانون نافذ کیا گیا۔ اور وہ آج تک بغیر دفعہ بندی کے بڑی خوبی سے چل رہا ہے۔ یعنی قانون میراث۔ قانون نکاح قانون طلاق وغیرہ۔ کیا وجہ ہے کہ اسلام کا قانون تعزیرات نہیں چل سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی قانون تعزیرات اور دوسرے قوانین Codification کے بغیر بہت اچھی طرح چل سکتے ہیں۔

پھر اسلامی قانون کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ وہ مجتہد مجسوس کا بنایا ہوا قانون (Judge Made Law) ہے۔ اور جس طرح اس قانون کی تشکیل ہوئی ہے بعینہ اسی طرح اسکا نفاذ بھی ہو سکا۔ حضورؐ کا فرمان ہے کہ اس امت کے آخری حصے کی اصلاح بھی اسی طرح ہوگی جس طرح اسکے اول حصے کی اصلاح ہوئی ہے۔

ان حضرات کو فقہاء کی عبادات پر اعتماد نہیں ہے اور یہ حضرات کہتے ہیں کہ ہم اسلام کی دفعہ بندی کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ فقہاء نے صدیوں کی کاوش و سعی سے اسلامی قانون تیار کیا ہے۔ اور ایک ایک لفظ کو بڑے غور و فکر سے تجویز کیا ہے۔ قانون میراث میں ان تجدید پسند حضرات نے خدا اور فقہاء کے مرتب کردہ قانون میں ترمیم چاہی اور (Muslim Family law) نافذ کیا۔ ان حضرات کا مقصد یہ تھا کہ یتیم پوتے اور پوتی کو اس کا حصہ رسدی اس طرح مل جائے کہ گویا دادا کی وفات کے وقت یتیموں کا باپ زندہ رہا ہو۔ اب اس مقصد کے لیے انہوں نے مسلم فیملی لاء کی دفعہ چار کو بدین الفاظ مرتب کیا کہ یتیموں کو وہ حصہ ملے گا جو ان کے باپ کو بصورتِ زندگی ملتا۔ اب اگر ایک شخص کی صرف ایک یتیم لڑکی ہے تو ان حضرات کے مقصد کے مطابق تو اسے والد کی میراث میں سے نصف حصہ دینا مطلوب تھا لیکن ان لوگوں نے دفعہ چار کی

(Codification) ایسے الفاظ میں کی کہ تنظیم پوتی کو سالم میراث مل گئی یعنی اگر باپ زندہ ہے اور دادا کے بعد فوت ہوتا ہے تو وہ نصف کی حقدار ہے اور اگر باپ دادا سے پہلے ہی فوت ہوتا ہے تو پورے ترکہ کی حقدار ہوگی اور عصبہ محروم ہو جائیں گے۔ یہ ہے ان تجدید پسندوں کا مبلغ علم۔ اب یہ مسئلہ سپریم کورٹ کے سامنے درپیش ہے اور فیصلہ ہونا ہے کہ آیا قانون سازوں کا مطلب یہ تھا کہ اس پوتی کو حصہ دے دیا جائے یا مسلم فیملی لا کا مقصد یہ تھا کہ شریعت کے مقرر کردہ حصوں میں بھی رد و بدل ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ لائیو پارٹنٹ دفعہ بندی نہ کرے تو اچھا ہے۔ حج صاحبان ان کے مقابلے میں اچھے تعلقہ پیش کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ ایسی غلط قانون سازی اور غلط ڈرافٹنگ کریں گے جن کو کئی سالوں کے بعد اعلیٰ عدالتیں درست کریں گی اور ان کا قیمتی وقت اس کام میں ضائع ہو گا۔

موجودہ صورت میں شریعت بل پاس ہونے کا ایک فائدہ یہ ہو گا کہ پاکستان کی ہر تحصیل کی سطح پر اسلام پر ایک ہمگیر تحقیقات شروع ہو جائے گی۔ وکلاء اور جج صاحبان رات دن تحقیقات کریں گے۔ مفتیان کرام فتویٰ نویسی شروع کر دیں گے اور یوں اس ملک میں متحد اسلام (Islamization) کا عمل تیزی سے شروع ہو جائے گا اور دو تین سال کے اندر اندر ہمارا لاء فیئر ٹنٹ اور اسلامی نظریاتی کونسل اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ دفعہ بندی کریں بشرطیکہ اس کی ضرورت سمجھی جائے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔ کسی کام کا آسان اور مشکل ہونا بھی نیت اور ارادے پر موقوف ہے۔ مثلاً ایک مریض ایک کڑوی گولی کھانا چاہتا ہے تو اس کو ایک گھونٹ پانی لے کر اسے حلق سے اتار لیتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں ایک مریض کھانا نہیں چاہتا اور آپ زبردستی اس کے حلق میں اتارنا چاہتے ہیں تو دیکھتے پہلے وہ دانت مضبوط کر دے گا آپ کو لکڑی یا کسی آلے کی مدد سے اس کا منہ کھولنا پڑے گا، پھر گولی اگر منہ میں پہنچا بھی دیں تو وہ حلق بند کر دے گا اور گل دے گا۔ معاملہ صرف اس قوم کے ارادے کا ہے۔ اگر ہم ہمیشہ قوم ایک ارادہ کر لیں تو یہ کام بڑی سہولت سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس ملک میں ایک چھوٹا سا طبقہ ایسا

ہے کہ اس کے حلق سے یہ کولی اترتی ہی نہیں۔ پوری قوم لگتی ہوئی ہے اور یہ طبقہ اس کولی کو اکل رہا ہے۔ اور یہ طبقہ فوج اور ریور کوریسی کے حساس مقامات پر بیٹھا ہوا ہے۔ حالانکہ پاکستان کی کوئی سیاسی جماعت بظاہر تنفاذ شریعت کی مخالف نہیں ہے اور اگر کوئی مخالف بھی ہے تو وہ بظاہر مخالفت نہیں کرتی۔ جہاں تک قوم کا تعلق ہے اس نے شریعت کے حق میں بار بار فیصلہ دیا ہے۔ ظہور پاکستان بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قوم شریعت چاہتی ہے۔ ظہور پاکستان کے بعد تمام تحریکات اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ قوم شریعت چاہتی ہے لیکن ایک حقیر اقلیت جو حساس مقامات پر بیٹھی ہے وہ اس راہ میں حائل ہے۔ اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے سب جانتے ہیں۔

شریعت بل اور دستور پاکستان

ہر اہمیت میں تضحی مضمر ہوتا ہے اور ہر تضحی میں اہمیت پوشا ہوتا ہے۔ اگر دن نہیں ہو سکا تو رات ہوگی ورنہ اگر رات ہوگی تو دن نہ ہو سکا اور اگر کوئی قانون اسلامی ہو سکا تو وہ لازماً اسلام کے منافی نہ ہو سکا۔

اسلامی نظام زندگی کا اصل الاصول یہ ہے کہ ہر طرز عمل، ہر فعل اور ہر چیز کا استعمال، اپنی اصلیت کے اعتبار سے مباح اور جائز ہے اور انسان اس میں آزاد ہے۔ الا یہ کہ قرآن و سنت کے کسی صریح حکم میں اسے ممنوع قرار دیا گیا ہو تو وہ حرام ہوگی۔

گویا شریعت میں کسی امر یا نہی کا ہونا اس بات کے ثبوت کے لئے مثبت دلیل ہے۔ امر ہے تو اس بات کا سرانجام دینا فرض ہے نہی ہے تو اس امر سے اجتناب ضروری ہے۔ مثال کے طور پر یہ معاملہ کہ سیون اپ پینا جائز ہے یا ناجائز؟ تو اس کا جواب دو طرح سے دیا جاسکتا ہے ایک یہ اللہ تعالیٰ نے اس جہان کو انسان کے استعمال کے لئے پیدا کیا ہے۔

کھاؤ پیو۔ لہذا یہ بات جائز ہے کہ کوئی سیون اپ استعمال کرے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ قرآن و سنت میں سیون اپ کے استعمال کے خلاف کوئی دلیل نہیں ہے لیکن صرف منفی دلیل اگر دی جائے کہ سیون اپ کا استعمال اسلام کے خلاف نہیں ہے تو اس محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سے مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ایک سوال باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ آیا اس کا استعمال فرض ہے واجب ہے یا مباح ہے۔ آیا قرآن و سنت میں اسے فرض قرار دیا گیا ہے۔ آیا اسے فرض نہیں قرار دیا گیا تو یہ امر موجب ثواب و برکت بھی ہے یا مثلاً اگر کوئی نماز پڑھتا ہے تو صرف یہ کہیں گے کہ اسے پڑھنے دو۔ اسلام میں نماز کے خلاف کوئی دلیل نہیں ہے لیکن اگر کوئی نہیں پڑھتا تو ہم پھر سیکولر سٹ ہو جائیں گے کہ تارک نماز کے خلاف پانی جانے والی تادیبی دفعات کو بروئے کار نہیں لانا چاہیں گے۔

یہ سب ۵۰ سالہ جس کی بناء پر بعض لوگ اسلام کے بارے میں وہ رویہ اختیار کرنا چاہتے ہیں جس کے بعد وہ ایک ایسی پوزیشن پر کھڑے ہوں کہ باہر مجبوری وہ اسلام کے خلاف رویہ تو اختیار نہ کر سکیں لیکن اسلام پر غل پیہا ہونے کے لئے بھی کوئی دستور اور قانون انہیں مجبور و پابند نہ کر رہا ہو۔ اور یہ وہی طرز عمل ہے جو گذشتہ ۴۰ سال سے مغرب زدہ اور سیکولر دماغ کے لوگ اختیار کئے ہوئے ہیں اور پاکستان کے سادہ اور زیادہ تر غیر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو وہ سوکھ دے رہے ہیں اور اب وہ بر مغانہ کہتے ہیں کہ ہم اس کے لئے تو تیار نہیں کہ اسلام کے خلاف کوئی رویہ اختیار کیا جائے لیکن اسلام کے مطابق طرز عمل اختیار کرنے پر بھی ہمیں مجبور نہ کیا جائے۔

اس کے برعکس شریعت کے حامی کہتے ہیں کہ نہ صرف یہ کہ اسلام کے خلاف طرز عمل نہ اختیار کیا جائے بلکہ اسلام کے مطابق مثبت اقدامات بھی کئے جائیں یعنی ایسے تمام اقدامات ختم کئے جائیں جو او ایٹمی نماز کے خلاف ہوں۔ مثلاً جمعہ کے دن مسلمانوں کو مجبور نہ کیا جائے کہ وہ کوئی ٹیوٹی دیں۔ نماز جمعہ کا وقت شروع ہو جائے تو اس وقت کاروبار بند کر دیا جائے۔ دکانوں پر تالے پڑ جائیں لیکن پھر اس کے بعد گھروں میں جا کر آرام نہ کیا جائے اور نہ سیر و تفریح کے لئے روانہ ہو جائیں بلکہ مسجد کی طرف دوڑ کر جائیں۔

منشی احمد امت اور مثبت اقدامات کا قصہ کوئی نیا نہیں ہے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کی دفعہ ۲۲ کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی قانون اسلام کے خلاف نہ بنایا جائے گا اور تمام موجودہ قوانین کو اندازاً ۱۰ سال میں اسلام کے مطابق بنایا جائے گا لیکن اس آرڈیننس میں یہ نہیں

واضح کیا گیا کہ اگر حکومت دس سال میں موجودہ قوانین کو اسلام کے مطابق نہ بنائے تو پھر کیا ہو گا۔ اس کے لئے دو تداریک دے سکتی تھیں۔ ایک یہ کہ دس سال کے اختتام پر جو بھی حکومت ہوگی۔ وہ دستور کی مخالفت کی وجہ سے ختم تصور ہوگی اور پھر دوبارہ تشکیل حکومت کے لئے نظام تجویز کیا جاتا اور دوسری تدبیر یہ ہو سکتی تھی کہ دستور میں کھلاڑ رکھ دی جاتی کہ ۱۰ سال کے اختتام پر وہ تمام قوانین جو اسلام کے خلاف ہوں یا مطابق نہ ہوں وہ کالعدم متدوریوں کے اور اسلامی شریعت نافذ تصور ہوگی۔ یہ بات اب شریعت پر کی دفعہ کی شکل میں سامنے لائی گئی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ فورم جس پر انعطاف عدالت کا اطلاق ہوتا ہے وہ اس بات کا پابند ہو گا کہ وہ شریعت کے مطابق فیصلہ دے چاہے تحریری قوانین میں جو بھی لکھا ہو۔ اس طرح ہر عدالت میں شریعت کی پہچان جائیگی۔ عدالت کے پریذائیڈنٹ جج آفیسر، وکلاء اور مقدمہ کے فریقین بدعتی پر مقدمہ میں کم از کم پانچ افراد شریعت پر تحقیقات کر رہے ہوں گے۔ پھر ہر مقدمہ میں کم از کم ایک ایڈیل اور ایک منظر ثانی ضرور ہوتی ہے اس طرح پندرہ مراحل پر اسلام کی تلاش اور تحقیق و جستجو میں باہم مسابقت ہوگی اور ایک مختصر عرصہ میں مطلع عدالت ساف ہو جائے گا۔



